جلال و جمال

ندیم

نیا ادارہ لاہور

فہرست

احمد ندیم قاسمی

تمہید

(۱)

فنونِ لطیفہ کے ہمراہ علمِ تنقید نے بھی اس صدی میں نمایاں ترقی کی ہے اور شاید یہ اسی ترقی یافتہ تنقید کا نتیجہ ہے کہ اب فن سے پہلے فن کار کو سمجھنا ضروری قرار دیا گیا ہے، پڑھنے والا جب تک اپنے ذہن کو شاعر کے انفرادی احساسات و تصورات سے ہم آہنگ نہیں کر لیتا۔ وہ شاعر کے کلام کی حقیقت و ماہیت کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس قسم کا کوئی فیصلہ دینے کا اسے کوئی حق حاصل ہے۔ اب تنقید ہوائی نہیں رہی، اور یہ مفید علم چند انے گنے موضوعات کی چہار دیواری کو توڑ کر شعر اور اس کے فنی لوازمات کے علاوہ شاعر اور اس کے مزاج کی کائنات پناہی کا بھی احاطہ کرنے لگا ہے، شیلے کی منتخب نظموں کا پیش لفظ لکھتے ہوئے ہنری نیو بولٹ کہتا ہے:-

> ہم شاعر کو عموماً کاریگروں کے زمرے میں شمار کرتے ہیں، وہ ایک گویا ہے، ایک نگینہ تراش ہے ایک بافندہ ہے —— ہم اس سے بحیثیت آدمی کوئی تعلق نہیں رکھتے، بلکہ ہمارا مطلب اس کے کام اور محض کام سے ہے، وہ بھی اس حد تک کہ یہ کام ہمارے مقصد کو کیسے پورا کرتا ہے، ہم یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اپنی جبلت اور وجدان کا اظہار کیسے کرتا ہے!

فن کار کو سمجھنے کے لئے سب سے اول (اور شاید سب سے آخر بھی) اس کی زندگی کے خاص خاص نشیب و فراز دیکھ لینا ضروری ہیں۔ خارجی ماحول نہایت شدت سے فن کار کی داخلی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لئے اپنے فنی نظریات کی تفصیل میں جانے سے پہلے میں اپنی زندگی کے چند ایسے واقعات پیش کر دینا چاہتا ہوں، جو میری نظموں اور غزلوں کی صحیح تفہیم میں شاید آپ کے ممد ثابت ہو سکیں، یہ تفصیل میری نظموں کی "عقبی زمین" ہے۔

نشیب و فراز کس انسان کی زندگی میں نہیں ہوتے، لیکن میرے ہاں جو نشیب ہیں۔ وہ عام نشیبوں سے زیادہ گہرے اور اندھیرے ہیں، میرے ہاں جو فراز ہیں وہ صاف ستھری ڈھلانوں اور لہراتی ہوئی کھلی پگڈنڈیوں سے محروم ہیں۔ یہ عمودی چوٹیاں اور بھیانک گگریں ہیں، جہاں ہوائیں گانے کی بجائے بلکتی رہی ہیں۔ اور جہاں سے گردوپیش کے صرف وہی قطعے نظر آتے ہیں، جہاں تک پہنچنے کے لئے میرے ماحول نے ایک مدت تک مجھے کوئی راہ نہیں سجھائی۔

۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو میں ضلع شاہ پور (پنجاب) کے ایک گاؤں انگہ میں پیدا ہوا یہ گاؤں کوہستانِ نمک کے اس پست مگر زرخیز و شاداب سلسلۂ کوہ میں واقع ہے، جو مغرب میں دریائے سندھ کے کناروں سے ابھر کر شرق میں پنجاب کے اضلاع میانوالی، شاہ پور، جہلم اور گجرات میں سے گزرتا ہوا کوہ ہمالیہ کے جنوب مغرب میں ایک نیلی قوس کی طرح ایستادہ ہے اس پہاڑ کے جو حصے آبادیوں سے کچھ دور ہیں، وہ پست قد درختوں سے پٹے ہوئے ہیں۔ ساون میں جب لمحہ لمحہ بھر بعد

جلال و جمال

گونجتی گرجتی گنگناتی گھٹائیں برستی ہنستی گاتی ان پہاڑوں پر جھک آتی ہیں تو دلکشا وادیوں اور ڈھلانوں پر لانبی لچکتی گھاس اُگ آتی ہے۔ اور اس گھاس کی ہلکی ہلکی خوشبو سے سارا علاقہ معطر ہو جاتا ہے۔ وادیوں اور ڈھلانوں میں ایک عجیب ان جانے تناسب سے ترشے ہوئے زینہ بزینہ سرسبز کھیت ہیں۔ پہاڑیوں کے قدموں میں ننھے ننھے دیہات ہیں۔ اور ان سفید اور سرخ مٹی سے لیپے پوتے ہوئے دیہات کے قدموں میں ان گنت کوئیں ہیں جن کے پاس ہریالی کا بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے۔ آئینہ نما جھیلیں ہیں۔ پہاڑیوں کے رنگ بوقلموں ہیں، سرخ، اُودی، نیلی، بھوری۔ قطار اندر قطار، سلسلہ در سلسلہ! ہوا گرمیوں میں نہایت خوشگوار اور سردیوں میں خشک اور کٹیلی ہے۔ ننانوے فیصدی آبادی مسلمان ہے۔ ان میں سے اکثر کا پیشہ کاشتکاری ہے، یہ دہقان اجڈ مگر پکے مسلمان، بہادر، غیور اور باوقار ہیں۔ جن لوگوں کی زمینیں بالکل محدود ہیں وہ فوج میں ملازم ہیں، کوہستان نمک کے دیہات کو تنومند اور بہادر فوجی سپاہیوں کا ذخیرہ سمجھا جاتا ہے۔ سانولے سلونے لڑکوں کی ابھی مسیں نہیں بھیگتیں کہ کوئی انگریزی ٹوپی والے صاحب بہادر چھڑی گھماتے کنکروں سے پٹی ہوئی گلیوں میں بے ربط قدم اٹھاتے چوپال پر وارد ہوتے ہیں۔ اور ان مفلس نوجوانوں کو بے زبان بھیڑوں کی طرح ہنکا کر بلندیوں سے اتار لے جاتے ہیں۔ یہ دیہات ریلوے اسٹیشنوں سے کافی دور واقع ہیں۔ اس لئے یہاں کے باشندے نئے دور کے احساس خود شناسی سے بہت حد تک محروم ہیں۔ اور شاید اسی لئے یہاں پولیس، سول، جنگلات اور دیگر محکموں کے افسران وہ گلچھرے اڑاتے ہیں کہ بایدو شاید! قانونِ انگریزی ان پہاڑیوں پر چڑھتے ہی لچک گیا ہے۔ اس میں بے شمار جھول پڑ گئے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب یہاں تھانے کے عین وسط میں ایک اچھے خاصے باعزت دہقان نوجوان کو ننگا کر کے بے شمار تماشائیوں کے درمیان سپاہیوں کے کچوکوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ تو نہ قانون کو طیش آتا ہے اور نہ یہاں کے طرح باز رئیسوں یعنی آبائی خوشامد پسندوں کی رگِ حمیت پھڑکتی ہے اس لحاظ سے یہ معصوم جنت ایک ہولناک جہنمی مرض میں مبتلا ہے۔ اور انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی نام نہاد "انقلابی" دفعات اور وزارتی وفد کی بلند بانگ "آزادی" نے بھی اس کی کوئی چارہ سازی نہیں کی۔

جولائی ۱۹۳۹ء تک میری زندگی افلاس و تمول اور دکھ سکھ کے ایک ایسے دائرے میں گزری، جہاں قدم قدم پر میرے معصوم ذہن کو ہولناک شکستوں اور آرزؤں کے گھناؤنے ملبے کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ میرا خاندان علاقہ سون سکیسر کے معزز ترین گھرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ احترام دنیوی دولت سے زیادہ مذہبی بزرگی کا منت کش ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے اسلاف عرب کے مجاہدوں کے ہمراہ ایران آئے اور تبریز کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا، وہاں سے بیشتر قسمت آزماؤں کی طرح ہندوستان پہنچے اور ملتان میں قیام اختیار کیا، جب بابر ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو ملتان کے چند بزرگوں کو علاقہ سون سکیسر کے صنم پرستوں کو تدریسِ توحید کے لئے منتخب کیا۔ ان حضرات میں میرے ایک بزرگ بھی شامل تھے سکیسر پہاڑ کے قدموں میں ایک بہت بڑی جھیل آئینے کے فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے اور اس کے آس پاس ننھی ننھی ڈھیریاں کھڑی ہیں۔ ان بزرگوں نے جھیل کے مشرق میں ایک پہاڑی پر اسلام آباد کے نام سے ایک گاؤں آباد کیا اور پھر یہیں کے ہو رہے مغلوں کے زمانے میں نہایت وقار سے زندگی گزارنے کے بعد نادر شاہ درانی کی یلغار کے دنوں میں انہیں یہ گاؤں خالی کرنا پڑا اور شمال مغربی پہاڑوں کی گپھاؤں اور جنگلوں میں چھپ گئے۔ جب درانی واپس ہوا تو یہ بزرگ اپنی پناہ گاہوں سے نکلے،

اسلام آباد لٹ چکا تھا۔ اس لئے اس کے شمال مشرق میں ایک اور پہاڑی پر موجودہ گاؤں انگہ آباد کیا۔ انگریزی راج کے شروع ہوتے ہی ہر نیازمند محکوم کی طرح ان بزرگوں نے بھی گوناگوں خدمات کے صلے میں سندوں کے پشتارے جمع کرنا شروع کئے، جو میرے اور میرے دوسرے بھائیوں اور عزیزوں کے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ایک ضخیم کتاب کی صورت میں ہمارے ہر سفر کا ناگزیر سامان بن گئے۔ اور جنہیں ہر سفید فام حاکم کے سامنے پھیلا کر ایک کرب آلود بیچارگی سے میں اپنے "خیر خواہوں" کے مشوروں کے مطابق سرکاری نوکری کی بھیک مانگتا پھرا۔ میرے خاندان کے مرید ریاست کشمیر کے جنوبی علاقے نیز گجرات اور سیالکوٹ کے اضلاع میں اب تک ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کی عقیدت بے پناہ ہے ایک مرتبہ میں نے بھی اپنے جوتوں کو ان عقیدت مندوں کے گروہ میں اس حالت میں گم ہوتے دیکھا ہے۔ کہ ہر شخص کی آنکھیں انہیں چوم کر چمک اٹھیں اور ہر "مرید" کے چہرے پر ایک بہت بڑے مذہبی بزرگ کے صاحبزادے کے جوتوں کو مس کر کے ایک آسمانی جلال چھا گیا۔ یہ میرے احساسات کی بیداری کا پہلا دن تھا۔ مگر یہ بیداری اس قدر اچانک اور فوری نوعیت کی تھی۔ کہ میرے عقیدے ابھی تک سنبھلنے نہیں پائے۔ تصوف و روحانیت کی قرون اُولیٰ کی صورتوں کا قائل ہونے کے باوجود اور بے شمار مذہبی بزرگوں کی ذات سے عقیدت رکھنے کے علی الرغم مجھے ہندوستان میں جگہ جگہ نہنے نہنے "سجادوں" کی اکثریت اسلامی نظامِ حرکت و عمل کے جسم پر ایک گلابی پھوڑے کے سوا اور کسی شکل میں نظر نہیں آئی۔ میں خیر و برکت کا قائل ہوں، لیکن لوٹ کھسوٹ سے مجھے نفرت ہے — اور یہاں میرا اشارہ صرف ان سجادوں کی طرف ہے، جنہوں نے خدا اور رسولؐ کے نام کی تجارت کر کے نذرانے بٹورنے کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ اور جن کی تعداد باعمل سجادہ نشینوں کے جلال و جبروت والے آستانوں سے یقیناً کئی گنا زیادہ ہے۔

جب میں نے آنکھ کھولی تو میرے مرحوم و مغفور والدِ گرامی ریاضت کی افراط سے فنا فی اللہ ہو چکے تھے، دن رات کی عبادت، وظائف اور تلاوتِ قرآنِ حکیم کے سوا انہیں کوئی کام نہ تھا۔ انہیں یہ احساس تک نہ تھا۔ کہ دنیوی حشمت بھی کوئی چیز ہے۔ میرا گھر افلاس و بدحالی کا ایک عجیب مرقع تھا۔ جس کی وجہ والد مرحوم کی سادگی اور چند اقارب کی "عقارب صفتی" تھی۔ پختہ مکان اور کھلے صحن — مگر پہننے کو موٹا کھدر اور کھانے کو جنگلی ساگ اور آگ تاپنے کو اپنے ہی ہاتھوں سے چنے ہوئے اُپلے! مدتوں بعد شہروں میں جا کر معلوم ہوا کہ بچوں کے پاس کوئی چیز "جیب خرچ" نامی بھی ہوتی ہے۔ اس پاس اکثر تمام رشتہ دار لڑکے امیر اور خوش لباس تھے، ان کی کتابیں نئی تھیں، ان کی سلیٹوں کے ساتھ موٹے موٹے سنہری اسفنج لٹکتے تھے! اور ان کی تختیوں پر ہتھیلیاں تھرک جاتی تھیں اور یہاں توے کی کالک سے روشنائی تیار ہوتی تھی۔ ان گنت کناروں والے سلیٹ کے ٹکڑوں پر سوالات حل ہوتے تھے۔ ایک ہی قلم کو "دہرے فرائض" کے لئے دونوں طرف سے تراش لیا جاتا تھا۔ مٹی کی دواتوں میں روشنائی سے زیادہ صوف ہوتا تھا — مگر ان کے باوجود ہونٹ سرخ اور چہرہ روشن تھا۔ اور اس اطمینان کا حقیقی سبب والدہ تھیں، جن کے وجودِ گرامی کی برکت سے مجھے اب تک ہر مصیبت میں مسکرانا اور ہر پہاڑ سے ٹکرانا آتا ہے۔

خاندان مشہور، محترم اور امیر تھا۔ اس لئے بچپن میں بھی گھر سے باہر نکلتے ہی ذہن میں عام انسانوں سے قدرے بلند

ہوسے کا جذبہ جاگ اٹھتا، مگر گھر آتے ہی یہ آبگینہ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جاتا، اور پھر یہ کرچیاں رات بھر میرے معصوم خیالوں کو کاٹتی کترتی رہتیں۔ اس کا تضاد نے مجھے ضرورت سے زیادہ اور وقت سے پہلے حساس بنا دیا!

عمر کے ابتدائی نو برس گاؤں میں گزارے، پانچ سال گاؤں کی مسجد میں قرآن مجید کا درس لیتے گزارا۔ ۱۹۲۳ء میں والد گرامی چل بسے۔ ۱۹۲۵ء میں ابتدائی چار جماعتیں پاس کر کے اپنے چچا جان خان بہادر پیر حیدر شاہ مرحوم کے ہمراہ کیمبل پور چلا گیا۔ مرحوم ان دنوں اٹک میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ وہاں ناز و نعم میں پلا، اور آرام و آسائش سے زندگی بسر ہونے لگی۔ مگر اس نئے پلٹے نے میری ذہنی دنیا پر بجلی گرا دی، دس مہینے نہایت ٹھاٹھ سے گزار کر جب میں ہر سال گاؤں میں آتا تو اچانک جیسے سدرہ کی بلندیوں سے تحت الثریٰ میں پٹخ دیا جاتا، حالات کا تضاد اب شدید صورت اختیار کر چلا تھا کیونکہ خام احساسات میں پختگی آ رہی تھی۔ اس عرصے میں چند عزیزوں کی ریاکارانہ بوالعجبیوں کے اسرار فاش ہوئے، خیالوں میں کھوکھلی شرافت کے بھانڈے پھوٹنے لگے، نمائشی امارت سے نفرت پیدا ہونے لگی۔ اور جذبات اتنے گداز ہو گئے کہ معمولی سے معمولی واقعہ بھی ایک ابدی نقش چھوڑے بغیر نہ گزر سکتا، گیارہ بارہ برس کا جو لڑکا دس مہینے نہایت آرام سے گزارنے کے بعد گاؤں آ کر امیر رشتہ داروں سے واپسی کا کرایہ طلب کرنے کی خاطر ان کی ڈیوڑھیوں تک جا کر رک گیا ہو، اور غیرت نفس سے مجبور ہو کر چپ چاپ پلٹ آیا ہو اور اپنی اداس ماں کی گود میں سر رکھ کر گھنٹوں روتا بلکتا رہا ہو، وہ اگر وقت سے پہلے حساس یا انتہا درجہ کا جذباتی ہو جائے، تو تعجب کا مقام نہیں!

چچا جان مرحوم عربی فارسی دونوں کے عالم تھے، لیکن ان کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر عربی کی طرف تھا۔ عربی اور فارسی کے علاوہ اردو میں بھی خاصے رواں شعر کہہ لیتے تھے، قیمتی کتابوں سے ٹھنسی ہوئی الماریاں ان کے کمروں کی زینت ہوا کرتی تھیں، ابھی پانچویں میں تھا کہ انہوں نے ہم سب بھائیوں کو تفسیر حقانی کا درس دینا شروع کیا، درس کے دوران میں جگہ جگہ حسان بن ثابت، سعدی، حافظ، غالب، حالی، اقبال کے اشعار سے مطالب واضح فرماتے، تلفظ درست کرتے، اشعار سے صحیح طور پر محظوظ ہونے کے طریقے بتاتے، امیر اور داغ کی شاعری سے بیزار تھے، کتب خانہ کا ایک حصہ مرحوم و مغفور نے ہمارے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اس حصہ میں قرآن مجید کی تفاسیر کے علاوہ مسلمان فلسفیوں کی کتابیں تھیں، اصفیائے کرام کے ملفوظات تھے، ساتھ ہی اقبال کی اردو فارسی تصانیف اور ہمایوں اور صوفی کی فائلیں تھیں۔
اس علمی و ادبی ماحول کا میری طبیعت پر اتنا گہرا اثر پڑا، کہ چھٹی جماعت ہی سے میں نے ایک بیاض میں اردو کے پاکیزہ اشعار لکھنے شروع کر دیئے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ان دنوں بھی مجھے غالب کا یہ شعر آج ہی کی طرح پسند تھا ؎

سراپا رہنِ عشق و ناگزیر الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

دس گیارہ برس کی عمر میں بے پناہ شعر کے معانی کا شعور، چچا جان مرحوم کی ہمہ گیر اور ہمہ صفت شخصیت کا معجزہ ہے، سیالکوٹ میں چچا جان مرحوم شمس العلماء میر حسن مرحوم کے شاگرد رہ چکے تھے، اور ڈاکٹر اقبال رح کے ہم سبق تھے، شاید اسی لئے بچپن سے اقبال کی شاعری سے انس پیدا ہوا، جو اب تک اسی شدت سے قائم ہے۔

بارہ برس کی عمر میں میں نے ۸۰ صفحات کا ایک ناولٹ لکھا، جو میرے ہم جماعتوں میں بہت پسند کیا گیا، اس عمر
میں مجھے چند اشعار موزوں کرنا بھی یاد ہے۔ ۱۹۳۰ء کے اواخر میں چچا جان مرحوم کے ہمراہ شیخوپورہ آنا پڑا، لاہور قریب ہی
تھا۔ یہاں کے لڑکے کیمبل پور کے لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ شوخ اور معلومات کے معاملے میں تیز تھے۔ ۱۹۳۱ء میں
میٹرک سے فارغ ہونے کے بعد ایک خاندانی حادثہ سے متاثر ہو کر میں نے ایک نظم کہنا چاہی اور کہہ لی، فوراً چچا جان مرحوم
کے پیش کی، انہوں نے پیٹھ ٹھونکی، موزونیٔ طبیعت کی داد دی ہمت بڑھائی اور نصیحت فرمائی کہ قومی مسائل پر نظمیں
کہنے کی کوشش کروں، اور غزل سے مجتنب رہوں (میرے خیال میں ان کا اشارہ امیر اور داغ کی غزلوں کی طرف تھا)
میں نے دوسری نظم مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے انتقال پر مرثیہ کی شکل میں کہی جو روزنامہ سیاست کے سنڈے ایڈیشن
میں صفحۂ اول پر بوقلموں رنگوں میں شائع ہوئی! یہ میری ادبی زندگی کا سب سے پہلا روشن دن تھا!

چچا جان مرحوم کا ارادہ تھا کہ حکومتِ پنجاب کی ملازمت سے فارغ ہو کر ریاست بہاولپور میں مشیر مال کا عہدہ
سنبھال لیں گے۔ اسی خیال کے ماتحت انہوں نے مجھے بہاولپور کالج میں بھیج دیا۔ مگر اس کالج میں "کالجیت" کم تھی
اور "مکتبیت" زیادہ تھی۔ شاندار عمارت بتاتی تھی کہ "میں ایک عظیم الشان دارالعلوم ہوں" اندر کمروں میں طریقہ تعلیم پکار
پکار کر کہتا تھا کہ "مجھ میں اور ایک مڈل اسکول میں کوئی فرق نہیں" تمدن پنجاب سے دور رہنے کی وجہ سے یہاں نہ ادبی
سرگرمیاں تھیں۔ نہ سیاسی مباحثے اور ڈرامے تھے۔ نہ کھیلوں کا معیار بلند تھا موضوع گفتگو کھجوروں کی نئی فصل سے شروع ہو کر
ہز ہائی نس کی کار کے سامنے لہراتی ہوئی جھنڈی دیکھتے ہی سائیکل سے اتر جانے، تانگے کو روک لینے اور مؤدبانہ کورنش
بجالانے پر ختم ہو جاتا تھا۔ اس لئے مزاج میں جو تڑپ تھی وہ ماحول کے جمود میں دبی پڑی رہی۔ اور اگر ابھری تو سلجھ نہ
سکی کہ اچانک علی گڑھ یونیورسٹی سے ایک خوش مذاق خوش اخلاق اور وسیع المطالعہ پروفیسر پیرزادہ عبدالرشید صاحب
جو ان دنوں کالج کے پرنسپل ہیں۔ اس کالج سے منسلک ہو گئے۔ اتفاق سے میرا نام انہی کے گروپ میں آگیا۔ اور سپاہیوں[ھ]
کا یہ گروپ ان کی زیر نگرانی چند ہی مہینوں میں کالج کی زندگی میں نت نئی تحریکوں کا منبع بن گیا۔ ڈرامے، مباحثے، مشاعرے
ادبی جلسے غرض کالج میں زندگی اور حرکت کی لہروں پر لہریں دوڑنے لگیں اور میری شاعری نے انہی دنوں پر پرزے
نکالنے شروع کئے۔

انہی ایام میں میرے ایک نہایت عزیز دوست محمد خالد (جنہیں ادیب بننا چاہیئے تھا۔ لیکن جو آج کل
انجینیرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان میں مقیم ہیں۔) نے مجھے آر ایل اسٹیونسن اور رائڈر ہیگرڈ
کے ناولوں کی روشنی میں مہماتی کہانیاں لکھنے کی ترغیب دی۔ ان کے پاس انگریزی کتابوں کا ایک ذخیرہ تھا۔
جو میرے مطالعہ کے لئے وقف کر دیا گیا۔ اور میں نے شاعری کے علاوہ افسانہ کی طرف بھی توجہ دینی
شروع کی۔

ھ SOLDIERS' GROUP

۱۹۳۴ء میں چچا جان مرحوم مشیر مال مقرر ہو کر بہاولپور تشریف لائے۔ تقرر کے بعد فوراً رخصت پر گاؤں گئے۔ اور وہیں حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے وفات پائی۔ زندگی کے بحرِ ذخار میں یہ تنہا منارہ نور بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تو دنیا اور اس کی رعنائیوں سے نفرت سی ہو گئی، کلبی ذہنیت کی شاید یہی بنیاد تھی جس نے ۱۹۳۹ء تک میری زندگی کو اور ۱۹۴۲ء تک میری شاعری کو ایک چیختے چلاتے ہوئے دھندلکے میں اندھا دھند بھٹکائے رکھا، مذہب، اخلاق، قانون، سماج، غرض ہر شعبۂ حیات میرے نزدیک ایک شکنجے کی صورت اختیار کر گیا۔ اور اس دباؤ میں احساسِ بشریت سسکیاں لیتا رہا، لیکن مرا نہیں، ایک خوشگوار سنبھالا ابھی میرے مقدر میں تھا!

مخدومی پیرزادہ عبدالرشید صاحب کی دستگیری اور کچھ اپنی ہمت سے مر مٹ کر ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور اب یہ پروانہ ہاتھ میں لے کر اور خاندانی سندوں کا ایک پلندہ کاندھوں پر رکھ کر اور مغربی طریق آداب رٹ کر میں نے ملازمت کی بھیک مانگنا شروع کی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک تقریباً سارے پنجاب کے چکر لگائے، خاندان کے پرانے مربیوں نے مسکرا کر دیکھا اور اظہارِ ہمدردی فرماتے سیر کو نکل گئے۔ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری، تحصیلداری اور نائب تحصیلداری سے لیکر انجمن حمایت اسلام میں کلرکی تک کے لئے نت نئے ڈھنگ کی درخواستیں لکھیں۔ ریفارم کمشنر کے دفتر میں بیس روپیہ ماہانہ پر محرری کا کام کرتا رہا، ضلع منٹگمری میں نو روز ٹیلی فون اپریٹر رہا، دار الاشاعت پنجاب میں تہذیب نسواں کے لئے انگریزی کہانیاں ترجمہ کرتا رہا، ایک ہندو بزرگ کو پانچ سو صفحات کی ایک کتاب چالیس روپیہ کے بدلے لکھ دی، جواب تک انہی کے نام سے خوب بک رہی ہے (ماشاء اللہ!) راولپنڈی میں ٹائپ سیکھتا رہا، محکمہ پنچایت سے لے کر محکمہ آرمی اپائونٹمنٹ تک کے دفاتر میں میرا نام بطور امیدوار درج رہا، ساتھ ساتھ مانگے تانگے کا لباس پہن کر ڈپٹی کمشنروں، کمشنروں اور فنانشل کمشنروں کے حضور باریاب ہوتا رہا — "میرے فلاں بزرگ نے انگریز جنرل میکسویل کو منی پوری فوجوں کی جائے پناہ کا پتہ دیا۔ اور "شیر دل" کا خطاب پایا" — "میرے فلاں عزیز نے تبت کی مہم سر کرنے میں لارڈ کرزن کو یہ امداد دی" — "میرے فلاں عزیز کو جنگِ عظیم میں سپاہی بھرتی کرانے کے صلے میں اتنے تمغے اور سندیں بخشی گئیں" — ایک غلام ایک تازہ غلامی اختیار کرنے کی خاطر انتہا درجہ کی غلامانہ خدمات کا سہارا لیکر اپنے اصول کے برخلاف اور اپنی ذہنیت کے برعکس اپنے ہمدردوں کے مشورے کے مطابق جگہ جگہ دریوزہ گری کرتا پھرا۔ کھو کھلے نظامِ حکومت میں کھوکھلی خدمات کا سکہ چل رہا تھا۔ مگر ایک بڑی مصیبت یہ تھی، کہ یہ خدمات انجام دینے والے مر چکے تھے۔ اور صاحب بہادروں کے پاس ڈالیاں پیش کرنے کی مجھ میں استطاعت نہ تھی۔ ہر جگہ ناکام ہوتا رہا، اور ذہن کا زہر ابلتا اور بکھرتا رہا۔ آخر ۱۹۳۹ء میں ایک محترم اور مشفق بھائی کیپٹن ملک امیر حیدر خاں صاحب نے بڑے جان جوکھوں کے بعد محکمہ آبکاری میں میرا نام بطور سب انسپکٹر منظور کرا لیا۔

۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیانی عرصہ میں میری المناک زندگی کے تاریک افق پر اچانک ایک کوندا سا لپکا، اور عام کوندوں کی طرح بجائے چمک کر تاریکیوں میں گھل جانے کے اندھیروں کا ایک سنہری عنوان بن کر وہیں جم کر رہ گیا، کیف و رو ہاں احساسات میں بالیدگی پیدا ہونے لگی، دکھ سکھ کے معیار بدلنے لگے۔ زندگی پر سے گرد و غبار

کی تہیں اکھڑنے لگیں اور میری ذہنی کلیت ایک خوشگوار نرم اور معصوم تبسم میں گھل کر کھو جانے لگی، یہی وہ دور ہے جب مجھے شاعری کی نازک ترین گہرائیوں کا احساس ہوا ہے، اور یہی وہ دن ہیں، جن سے میرے فن کی ہر رنگینی عبارت ہے۔ ۱۹۳۶ء کے اواخر میں یہ کوندا تاباں رہنے کی ایک دردناک اور مایوسانہ کوشش کے بعد بجھ کر رہ گیا۔ اور میرے خیالوں کے گلابی کہرے میں ایسی سرمئی لہریں دوڑ گیا جن کا آغاز کوندے کا غروب تھا، اور انجام ہنوز ناپید ہے۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک میں اکثر لاہور میں قیام پذیر رہا، تین تین روز کے فاقوں کا کربناک تجربہ حاصل ہوا، دو دو ہفتے اکیلے بغیر تیمار دار کے ایک گھپ اندھیری کوٹھڑی کے اندر شدید بخار میں جل بھن کر گزار دیئے۔ ایک مرتبہ کہیں سے قلم کی مزدوری ملی، اتفاق سے اس روز کوئی تہوار تھا، بجائے جی بھر کر کھانے کے میں نے سینما ہال کی راہ لی، تین بجے وہاں سے نکل کر ایک اور فلم گھر میں گھس گیا، شام کو وہاں سے فارغ ہو کر ایک اور تفریح گاہ میں چلا گیا۔ نو بجے رات کے وہاں سے نکلا، تو جیب میں ایک اور تفریح کا سامان موجود تھا، سو ایک مشہور سینما ہاؤس میں ایک اچھے درجے کا ٹکٹ لیکر بیٹھ گیا، ایک بجے وہاں سے نکلا، تو جیب میں صرف ایک دونی تھی۔ بھوکا پیاسا بغیر کسی مقصد کے ایک طرف چل دیا، نہر کے پل پر پہنچ کر ایک طرف پلٹ گیا، سست رو پانی میں ستاروں کے مٹیالے عکس دیکھ رہا تھا، کہ پو پھٹی اور مجھے احساس ہوا کہ میں کل صبح سے اپنے آپ میں نہیں ہوں۔ یہ اور اس قسم کی اور آوارگیاں میرے ایسے کئی نوجوانوں کی زندگیوں کے عامۃ الوقوع واقعات ہیں، لیکن یہاں میں اپنا ذکر کر رہا ہوں ـــــ ایک شاعر کا ذکر ـــــ جس کی نظموں پر اگر ان واقعات کا اثر نہ پڑے تو وہ مخلص نہیں، وہ محض نقال اور مقلد ہے۔

لاہور میں حضرت اختر شیرانی کی روح نواز صحبتیں میسر آئیں، بلکہ چار مہینے میں ان کا مہمان رہا (لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ مجھ سے اس تمام عرصہ میں اپنی زندگی کی ایک بہت بڑی خصوصیت کو چھپائے رہے اور میں خوش ہوں کہ انہوں نے میری "سعادت مندی" اور "پاکیزہ نفسی" کے مدِ نظر مجھے آتشِ سیال کی ان جنتوں کا علم تک نہ ہونے دیا۔ جن کو میں مدتوں تک ان کی شاعرانہ سرشاریاں سمجھتا رہا، عین ممکن ہے، کہ میں ان دنوں احساسات کے بے پناہ طوفان سے تنگ آ کر ادھر کا رُخ کر لیتا، مگر میں خوش ہوں اور یہ فخر نہیں اظہارِ اطمینان ہے کہ میں ان جنتوں سے آج تک محفوظ رہا ہوں) انہی دنوں منصور احمد مرحوم اور حامد علی خاں صاحب سے تبادلۂ خیالات کا موقعہ ملا، اور بد قسمتی سے یہ فرض کر بیٹھا کہ اردو رسائل کے تمام مدیر ایسے ہی مخلص، مہربان اور مکمل انسان ہوتے ہیں، برادرِ گرامی حضرت مولینا غلام مرشد صاحب کے توسط سے حضرت مولانا عبدالمجید سالک مدیر روزنامہ "انقلاب" کے ہاں پہنچا، اور اچانک میں نے محسوس کیا، کہ میری زندگی کی تمام منزلیں معین ہو گئی ہیں، ممدوح کی محبوب شخصیت نے میری ادبی زندگی کے ہر شعبے پر اتنے گہرے، پائدار اور انمٹ اثرات ڈالے ہیں، اور مجھ پر انہوں نے اس قدر احسانات کئے ہیں، کہ اول تو یہاں ان کی تفصیل بے محل ہوگی اور اگر تھوڑا سا ذکر بھی کر دوں تو ان حقائق کو غلو پر محمول سمجھا جائے گا،

۳ جولائی ۱۹۳۹ء کو میں نے ملتان کے دفتر آبکاری میں کام کرنا شروع کیا، بھائی کرشن چندر نے پیغام بھیجا "بیکاری سے آبکاری بھلی" ـــــ حضرت جوش ملیح آبادی نے تحریر فرمایا ؎

جنابِ قبلہ و کعبہ کی آبکاری ہے
شراب جو نہ پیئے آجکل وہ ناری ہے

۲۰ستمبر ۱۹۴۲ء کو یہ کابوس میرے سینہ سے اترا، ان تین سالوں کے مجموعی تاثرات کا جائزہ لینے کے لئے میں اپنی ہی ڈائری کے چند اقتباسات نقل کیے دیتا ہوں:- (ان اثرات کے علاوہ اس عرصہ میں میرے "شباب" نے چند ٹھوکریں کھائیں، جو میرے حق میں اس لحاظ سے مفید ثابت ہوئیں، کہ میرے جنسی جذبات ژولیدہ نہ ہونے پائے اور ۳۶ء ـــ ۳۷ء میں انہیں جو آسانی سہارا میسر آیا تھا وہ مضبوط تر ہو گیا)

میرے احساسات پر کچھ ایسا کہرا سا پھیل گیا ہے کہ میں روشنی اور سائے میں تمیز نہیں کر سکتا پچھلے دنوں چند روشنیوں اور سایوں سے میری مڈبھیڑ ہوئی، لیکن نہ روشنیوں نے کوئی کرن چھوڑی نہ سایوں نے کوئی پرچھائیں، روشنی بھی گذر گئی، سائے بھی گذر گئے، اور میرے اردگرد پھیلے ہوئے کہرے پر کوئی ہلکی سی خراش بھی نہ پڑی ـــــ

ـــ عجیب زندگی ہے! سوچتا ہوں کہ میں اپنے آس پاس ہی اندھوں کی طرح ٹٹول کر کوئی "چقماق اثر" مادہ ڈھونڈ لوں، اور اپنے چاروں طرف چنگاریوں کی ایک پھوار برسا لوں، جب چاہوں روشنیاں چھڑک دوں، جب چاہوں اندھیرے پھیلا دوں ـــ میرے خیال میں ان مضحکہ خیز تصورات کے پیچھے کوئی آرزو کلبلا رہی ہے ـــ کام کرنے کی آرزو، زندہ رہنے کی آرزو، لیکن میرے پاس کوئی کام نہیں، اس لئے زندگی کی صحیح لذت نصیب نہیں ـــ یہ کہرا چھٹنے سے رہا، سانس لو، آنکھیں جھپکاؤ، اور مر جاؤ!

ـــ عجیب ماحول ہے، نہ گھنگھروؤں کی جھنکاریں، نہ دوشیزاؤں کی الاپیں، نہ میدانِ جنگ کا طبل، نہ قومی اجتماعوں کا جوش! بس دفتر کی بھاری اور سنگین دیواریں، غلیظ قلم اور خاکستری کاغذ ـــ بوڑھے چپراسی اور بدمذاق افسر، چرس اور افیون کے سودے اور بے چین نیندیں!

۲۸ فروری ۱۹۴۱ء

ان دنوں تذبذب نے میری کشتِ احساس پر ہل جوتے رکھا، ہر طرف خراشیں سی محسوس کرتا ہوں، پرانی مٹی، نئی اور تازہ مٹی کے نیچے دب گئی ہے، لیکن اس تازہ مٹی میں تازگی کی سڑاند سی ہے۔ تازگی اور سڑاند! ـــ الٹی سی بات ہے لیکن یہی الٹی باتیں اکثر کیسی کڑی حقیقتیں ثابت ہوتی ہیں!

۲۱ اکتوبر ۱۹۴۱ء

خیالات و تصورات کا ایک گونجتا ہوا طوفان میرے دل و دماغ کی وسعتوں

میں اس شدت سے چلتا ہے، کہ میرے ارادوں اور امنگوں کی طنابیں کھچ جاتی ہیں، میری امیدوں کے صنوبر ٹوٹتے ہیں، میری تمناؤں کے ذرّے وحشتناک چکر اتے ہوئے رقص کرتے ہیں اور میں سر کو تکیے میں چھپا کر ہراساں انداز میں بہت دیر تک لیٹا رہتا ہوں ....

اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں، کہ میں اپنے ماحول میں محبوس ہوں —— میں منحوس مخبروں کے احسان اٹھاتا ہوں، پولیس کی منتیں کرتا ہوں، ناکہ بندیاں کرتا ہوں، چھاپے مارتا ہوں، ہتھکڑیاں لگواتا ہوں، استغاثہ تحریر کرتے ہوئے بڑے بڑے جھوٹ تراشتا ہوں، عدالتوں میں قسم اٹھا کر غلط باتیں کہتا ہوں، جب میں دیکھتا ہوں، کہ میرے کئی بے گناہ شکار "انصاف" کے شکنجے میں پھنس کر جیل جا رہے ہیں، تو میں کٹہرے کے بالائی حصے کو ہاتھوں میں جکڑ لیتا ہوں، میرا احساس میرے چٹکیاں لیتا ہے اور تمام رات میرے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی رہتی ہیں۔

۱۶ر جون ۱۹۴۲ء

آج میری زندگی کا نازترین دن ہے، آج میں احمد شاہ اکسائز سب انسپکٹر کے بجائے صرف احمد ندیم قاسمی ہوں، تجربات کا ایک انبار سمیٹے میں اپنے ماضی کے کھنڈروں سے رخصت ہو رہا ہوں۔

۲۰ر ستمبر ۱۹۴۲ء

۲۵ر ستمبر ۱۹۴۲ء کو میں نے دارالاشاعت پنجاب (لاہور) میں بحیثیت ایڈیٹر "تہذیب نسواں" اور "پھول" کام کرنا شروع کیا۔ یہ میری ادبی زندگی کا نیا دور تھا، ذات کی حدبندی سے ابھر کر میری نظریں کائنات پر پڑنے لگیں، بھائی خورشید احمد خاں سے ارسطو اور افلاطون سے لیکر سر رادھا کرشنن تک تمام فلسفیوں کے متعلق مباحثے ہوئے، نئی ادبی قدروں کو بزرگوں کی جابرانہ تنقید سے بچ کر ایک تعمیری اور توانا نقطۂ نظر سے دیکھا، شعرا کی جماعت بندیوں کی عجیب وغریب نفسیاتی وجوہ معلوم کیں۔ ۱۹۴۳ء میں مشہور ترقی پسند رسالہ ادبِ لطیف (لاہور) کی ادارت سنبھالی۔ ۱۹۴۴ء میں سالنامہ ادبِ لطیف کے ایک مضمون سے خفا ہو کر حکومت پنجاب نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے ماتحت گرفتار کر لیا، یہ مقدمہ ایک برس چلتا رہا، اس دوران میں ایک شدید اور خطرناک نوعیت کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ مئی ۱۹۴۵ء میں مقدمہ سے بری ہو کر گاؤں آ گیا، اور فروری ۱۹۴۶ء میں علالت کے مدنظر ادبِ لطیف کی ادارت چھوڑ دی، تب سے گاؤں میں مقیم ہوں،

میری ابتدائی زندگی کی افراتفری، عنفوانِ شباب کی لامرکزیت، اور عالمِ جوانی کی شکست خوردگی کے حالات آپ نے پڑھ لئے، لیکن مصائب اور حوادث نے مجھے ابدی مایوسی کے جہنم زار میں نہیں جھونکا، مجھ سے میرا جذبۂ خودداری اور غرورِ نفس نہیں چھینا، میرے خلوص اور انسانی محبت پہ ڈاکا نہیں ڈالا، شاید یہ فطرت کا ردِ عمل ہے کہ میں اب

مدتوں تک ہنس کر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے دنیا کے کسی انسان سے نفرت نہیں۔ اور میرا نظریۂ حیات اتنا وسیع اور جذبۂ ارتقا اتنا بلند ہے کہ مجھے عظیم رفعتیں بھی ہیچ نظر آنے لگی ہیں، صرف ایک تمنا ہے کہ میں اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کے ذریعے انسانیت کی عصمت و طہارت قائم رکھتے ہوئے ایک ایسے نظام کی تعمیر میں ممد ثابت ہو سکوں جس میں ہر انسان دوسرے انسان کو انسان ہی سمجھے۔ کالا یا گورا، مشرقی یا مغربی، غلام یا آقا نہ سمجھے ——— لیکن میرے اس "کارنامے" میں بھی ایک حسن ہو ——— فنکارانہ بانکپن ہو ——— غیر فانی جوانی ہو!

(۲)

جلال و جمال دس برس میں کہی ہوئی میری نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے، میں نے اپنے ابتدائی کلام کو قطعی طور پر خارج کر دینا گوارا نہیں کیا، اول تو اپنے فن کی ارتقائی کڑیاں اجاگر کرنے کے لئے میں اپنی کئی ابتدائی نظموں کی شمولیت پر مجبور ہو گیا ہوں، دوسرے یہ نظمیں کئی وجوہ سے مجھے عزیز ہیں، ان سے میری زندگی کی کئی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔ اور فنی لحاظ سے بھی مجھے ان کی سادگی اور صفائی پسند ہے۔ سالہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک کا کلام محض مشق کا درجہ رکھتا تھا، اسے میں برسوں پہلے تلف کر چکا ہوں، ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک کے کلام کا نہایت کڑا انتخاب کیا گیا ہے۔ اور ۱۹۴۲ء سے لیکر اب تک کی نظموں اور غزلوں کو بھی نہایت سختی سے اپنی ذاتی تنقیدی کسوٹی پر پرکھا ہے اور کئی نظموں کو خارج کر دیا ہے۔ میری بسیار گوئی کے مقابلے میں یہ مجموعہ مختصر ہے بعض حضرات کو اس عجیب و غریب اختصار پر حیرت ہوگی، لیکن میری کائنات اتنی محدود نہیں رہی، کہ میں چند خاص موضوعات میں گھر رہ جاؤں میں نے ہر اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ جو میرے خیالوں کی دسترس اور میرے شعور و وجدان کے دائرے میں آسکا۔ لیکن اتنے موضوعات محض تعداد کے اضافے کے لئے نہیں چنے گئے۔ بلکہ میں نے جو کچھ کہا، وہ احساس کی اس خاص رو سے مجبور ہو کر کہا۔ جسے "روحانی نغمگی" سے بہتر نام نہیں دیا جا سکتا ——— ان نظموں کے علاوہ میرے فن کا ایک اور رُخ بھی ہے۔ جو مجھے ہمیشہ نہایت عزیز رہا ہے، یہ میرے قطعات ہیں۔ جو دھڑکنیں اور پھر رم جھم کے نام سے الگ شائع ہو چکے ہیں۔ اپنے منظوم ڈراموں کی ترتیب میرے مدنظر ہے۔

نظموں کے انتخاب میں کسی اور شخصیت یا کسی اور مذاق کا دخل نہیں رہا۔ انتخاب قطعی ذاتی، ذوقی اور وجدانی معاملہ ہے۔ اگر انتخاب کی مہم کسی اور صاحب کے حوالے کر دی جاتی تو آج اس مجموعے کی بالکل دوسری صورت ہوتی، جسے میں برداشت نہیں کر سکتا تھا، میں شاعر کی شاعری اور ادیب کے ادب کو اجتماعی سرمایہ سمجھتا ہوں لیکن بحمد اللہ مجھے اپنے ذوق پر اعتماد ہے اور مجھے فرد اور ساری نوع انسانی کے گہرے رابطے کا علم ہے، اسی لئے میں اس متنوع مرکب کو کسی ایسے صاحب کے پاس نہیں لے جا سکا، جو میرے انفرادی دکھ سکھ سے بے پروا ہو کر اپنے ذوق اور اپنے معیار کے مطابق نظمیں چنتا یہ بالکل ایسا ہی تھا، جیسے ہندوستان کے سیاسی مسائل کو سلجھانے کے لئے ہندوستانی لیڈر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر کو دہلی میں بلا لائیں۔

حالات زندگی میں نے واضح کر دیئے۔ لیکن حالات کے علاوہ خیالات بھی فنکار کی تخلیقات پر اسی شدت سے

اثر انداز ہوتے ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنے فنی نظریات میں سے چند ایک اہم باتوں کا یہاں ذکر کر دوں۔ مقصد یہ نہیں کہ پڑھنے والے میرے ہم خیال ہو جائیں، یا میں اپنی نظموں پر ایک مبسوط اور یک طرفہ تبصرہ کر کے نقادوں کو ان کے کام سے فارغ کر دوں۔ مقصد محض یہ ہے کہ جلال و جمال کا پس منظر مبہم اور رگڈ مڈ نہ رہے، میں اپنے فنی نظریات کو "حرفِ آخر" نہیں سمجھتا، حالات کے تغیر کے ساتھ ان میں سے بھی کئی بدل سکتے ہیں، یہ نظریات جیسے بھی ہوں بہر کیف میری شاعری ان سے متاثر ضرور ہوئی ہے۔

شروع شروع میں مجھے غزلیہ اور نشاطیہ رنگ سے شغف رہا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ——— بالکل متوازی۔ دو اور لہریں بھی اسی رفتار سے رواں دواں رہیں، سماجی حالات سے بیزار ہو کر میں نے کئی "تلخ نظمیں بھی کہیں" اور پکا مسلمان ہونے کی حیثیت میں مذہبی اور حکیمانہ رنگ میں بھی شاعری کی، غزلیہ اور نشاطیہ رنگ آہستہ آہستہ صحت مند غنائی رنگ میں بدلتا رہا، سماجی مسائل کے بیان میں تلخی کم ہونے لگی، کیونکہ صرف تلخی توانا ادب پیدا نہیں کر سکتی، میں نے سماجی و سیاسی مسائل کو طیش میں آکر دیکھنے کے بجائے، اعصاب زدگی سے بچ کر اور سنبھل کر ان میں ڈوب جانا اور سنجیدگی سے ان پر غور کرنا بہتر سمجھا، مذہبی رنگ کی شاعری مولانا ظفر علی خاں اور پھر ڈاکٹر اقبال رح کے خیالات کی بازگشت تھی، اسلامی لٹریچر بہت وسیع ہے۔ اور مجھے اس کے گہرے مطالعہ کے وافر مواقع نہیں ملے اس لئے میں اس صنف میں کسی نوع کی انفرادیت نہ پیدا کر سکا، مگر آئندہ چل کر اس رنگ میں بھرپور انداز میں لکھنا میری نہایت عزیز تمناؤں میں شامل ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ میں اسلام کو ایک آفاقی نظامِ حیات کی صورت میں آئندہ اپنی نظموں میں پیش کر سکوں۔

جیسا کہ میرے حالات سے واضح ہے، میں آغازِ بلوغت ہی میں ناخوب و خوب اور تیرگی و نور کے دھندلکوں میں ٹامک ٹوئیے مارتا پھرا۔ اس لئے روحانی خلفشار، تردد، تشکک "تحیر" میری نظموں پر اپنے عکس ڈالتے رہے، جبلی اور خارجی مؤثرات سے پیدا شدہ ذہنی ہچکچاہٹ اور رکاوٹ قدم قدم پر مجھے الجھاتی رہی۔ فیشن کے مطابق انقلابی نظمیں کہیں جن میں شاعری سے زیادہ وعظ اور فنی لوازمات سے زیادہ شیون اور سینہ کوبی کا دخل تھا، وفورِ ہیجان نے ذہنی تراج کی صورت اختیار کر لی، سرکاری ملازمت کے دوران میں ایک دفعہ اپنے ہیڈ کوارٹر کو اعلیٰ افسروں کی اجازت کے بغیر چھوڑ کر کمونسٹوں کے ایک جلسے میں "نعرۂ انقلاب" کے عنوان سے ایک نظم پڑھ دی، اور خفیہ پولیس کی رپورٹوں سے بہزار مشکل پیچھا چھڑایا۔ دراصل یہ گرج اور دھاڑ سطحی وطن پرستی کے شعبدے تھے۔ ان حالات میں جوانی کے ساتھ ہی وداعِ جوانی کے احساسات زور پکڑنے لگے۔ اور میرے خیالات میں ایک گھٹن سی، ایک یاس سی، ایک نوع کی ابدی بے دست و پائی کی چبھن گھر کرنے لگی۔ لیکن اپنے حقیقی برادر گرامی محمد بخش صاحب اور عم زاد بھائی محمد حیات صاحب کے سہاروں اور تسلیوں، والدۂ مکرمہ کے درسِ خود اعتمادی اور جذبۂ خودداری، مخلص احباب کی دلنوازی، نیز محبت کی ایک نہایت معصوم اور دلربا صورت نے مجھے اچانک نئی امنگوں اور تازہ ترنگوں سے فیض یاب کیا، میں جو ہوا سے اتر کر زمین پر آگیا، خلا کی شاعری سے نفرت ہونے لگی، غریبوں کے متعلق غریب

کی حیثیت سے لکھنا شروع کیا۔ کسانوں کے بارے میں کسان بن کر لکھا۔ انسانیت کا ارتقاء اپنے بیشتر خطوط کی پوری وضاحت سے میرے سامنے آ گیا نغمگی جو شروع ہی سے میرے ساتھ رہی تھی، مجھے کھنڈروں سے نکال کر کھلے میدانوں میں لے آئی، رومان اور حقیقت کے تصادم سے جو شعلہ ٹوٹا، اسی نے میرے ذہن کی وسعتوں کو روشن کر دیا، اور رگ رگ کی ہوئی بالیدگی ایک البیلی ندی کی صورت میں زمین دوز پناہ گاہوں سے نکل کر دنیا کے گوناگوں مناظر کے عکس ہنستے، کھیلتے، لچکتے لپکتے قبول کرنے اور اپنے اندر ضم کرنے لگی۔

(۳)

اردو کے ہر شاعر کی طرح میں نے بھی ابتدا میں بے شمار غزلیں کہیں اور مسلسل مشق سے زبان اور بیان پر اپنی گرفت کو مضبوط کرنے میں کوشاں رہا، مجھے ایک بزرگ نقاد کا یہ قول کبھی نہیں بھول سکتا، کہ "شاعر جب تک نہایت اچھی غزل نہ کہہ سکے اسے نظم کی طرف متوجہ ہی نہ ہونا چاہیے، غزل شاعر کی تمام فنی قوتوں کی آزمائش ہے"۔——

وہ شعرا بھی جو ان دنوں غزل کو مردود قرار دے رہے ہیں، ابتدا میں اسی دیوی کے پجاری تھے۔ حالیؔ اور اقبالؔ کے بعد جوشؔ نے نظم گو شعرا میں سب سے زیادہ شہرت پائی ہے لیکن روحِ ادب اور شعلہ و شبنم کی غزلیات اب تک نقادِ موصوف کے قول کی صداقت کی آئینہ دار ہیں۔ نظم کو اپنا محبوب ذریعۂ اظہار بنانے کے باوجود مجھے غزل سے محبت رہی ہے اس لئے نہیں کہ طرزِ اظہار ہمارے ماضی کی یادگار ہے، بلکہ اس پسند کی چند بنیادی وجوہ ہیں اور میرا یقین ہے کہ اردو نظم کے ساتھ ساتھ اردو غزل بھی اسی دلآویز رفتار سے ترقی کی راہوں پر گامزن رہے گی، جس نے میرؔ، مومنؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور فانیؔ ایسے شعرا کو مسحور رکھا۔

غزل قدیم تصورات سے عبارت سہی، لیکن فنِ شاعری میں کسی صنف کو صرف اس کی ہیئت کی قدامت کے باعث مردود و مطعون نہیں قرار دیا جا سکتا۔ میرے خیال میں نظمِ آزاد شاعری کا قدیم بلکہ قدیم ترین اور شاید اولین طرزِ اظہار ہے، کہا جاتا ہے، کہ حسن و جمال، عشق و محبت، ہجر و وصال اور گریہ و تبسم کا ذکر غزل میں غرضِ مشترک ہے۔ مگر موضوع کی یک رنگی بھی تو کوئی نقص نہیں خصوصاً جب یہ موضوع انسانی زندگی کے نمایاں حادثات میں نمایاں ترین حیثیت رکھتا ہے، اور پھر جب اس موضوع میں صد ہا گنجائشیں ہیں، کیا کبھی کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات آ سکتی تھی، کہ غالبؔ کے بعد کوئی شاعر اردو غزل میں کوئی نئی بات کہہ سکے گا! مگر بالِ جبریل کی غزلیں اس حقیقت کا واضح ثبوت ہیں، کہ اقبالؔ نے غزل کو ایک نہایت ترقی یافتہ صنفِ شاعری کی صورت میں پیش کیا۔ اور اس میں موضوعات کے تنوع کو سمو کر ثابت کر دیا، کہ غزل میں دنیا جہان کے تمام پاکیزہ مسائل کھپ سکتے ہیں، جوشؔ نے شعلہ و شبنم کی غزلوں میں حافظؔ کے فانوس سے اپنا چراغ جلا کر اردو غزل کو صحت مند، جاندار اور توانا فطری جذبات کا مرقع بنا دیا، اور پرانی غزل کی روتی بسورتی اور اونگھتی لڑکھڑاتی فضا میں ایک مترنم للکار پیدا کر دی، فراقؔ نے جوشؔ سے ایک قدم آگے بڑھ کر پرانے موضوع ہی کو اپنی غزلوں میں نئے نکھار اور سنگار سے پیش کیا اور محبوب کے جسم ایسے نازک اور پھسلنے موضوع کو ایسی بے پایاں لطافت، نزاکت اور لچک سے اپنایا، کہ کوئی دوسرا شاعر

ہوتا تو عریانی اور فحاشی پر اتر آتا، اس نے بارد اور بوسیدہ خیالات پر خطِ تنسیخ کھینچ کر عشق کی کائنات پہنائی اور حسن کی ہمہ گیر سپردگی کے، ایسے دلنواز گیت گائے اور عشق و حسن کے علاوہ دنیا جہان کے اسرار کو اس خوبی سے غزل میں سمویا، کہ میرے خیال میں اب ہماری غزل صرف غالب، اقبال، فانی اور فراق کے کلام کے سہارے صدیوں تک زندہ رہ سکے گی، اس کا حسن نمائشی اور اس کے عشق کا جسم بوا نہیں رہا۔

غزل پر یہ اعتراض کہ اس صنف میں ادنی شاعری کی بھرمار ہے' بالکل صحیح ہے' لیکن اگر یہ اعتراض کرنے والے آزاد شاعری کے دلدادہ ہیں تو اب انہیں احساس ہو چلا ہوگا، کہ آزاد نظموں میں غزلوں سے کہیں زیادہ ادنی شاعری ہو رہی ہے' اور آزاد شاعری کو جس قدر ان "تجربہ پیشہ" نوجوانوں نے بدنام کیا ہے' اتنا "رجعت پسند" نقادوں سے بھی نہ ہو سکا، —— اور پھر پست اور معمولی شاعری کس زبان میں نہیں' اس سے متاثر ہونا، یا اس کی طرف متوجہ ہونا بالکل غیر ضروری اور بیکار ہے۔

سب سے بڑا الزام یہ ہے، کہ غزل کے اشعار میں تسلسل نہیں پایا جاتا، لیکن ہماری زندگیوں میں کونسا تسلسل موجود ہے' جو ہمیں غزل کے اشعار میں تسلسل کی تلاش پر مجبور کرے' غزل میں جونہی تسلسل پیدا ہوا اس نے نظم کا روپ اختیار کر لیا، جن لوگوں کو تسلسل مرغوب خاطر ہے۔ ان کے لئے نظم موجود ہے' —— صبح سے لیکر شام تک ہم جو کچھ کرتے اور کہتے ہیں' اس میں سب سے نمایاں خصوصیت عدم تسلسل ہے۔ اس طرح غزل کے تمام اشعار مل کر ہماری زندگی کے ایک دن سے مماثلت رکھتے ہیں۔ اگر استعارے کو طول دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے، کہ اگر غزل ایک دن ہے تو نظم ایک پل ہے۔ پل محدود اور اس لئے مسلسل ہے۔ دن غیر محدود اور اس لئے غیر مسلسل ہے۔ اور جہاں ہم "پل" کو قبول کرتے ہیں' وہاں "دن" کو بھی اسی عالی ظرفی اور خندہ پیشانی سے قبول کرنا ہوگا، کیونکہ اگر "پل" ایک اکائی کی صورت میں اہم ہے' تو ان اکائیوں کی شیرازہ بندی کی اہمیت سے بھی منکر نہیں ہونا چاہیئے۔

اگر نظم کے ساتھ غزل کو بھی پنپنے دیا جائے' تو ادب کو نقصان پہنچنے کے بجائے اس کے قیمتی سرمائے میں اضافہ ہوگا، نظم کے عروج کی عمارت غزل کے زوال کی بنیادوں پر کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ غزل کو رد کرنے سے پہلے اس کا ایجاز و اختصار دیکھیئے، اس کے اشعار کی "نشتریت" کو محسوس کیجئے' اور یقین کرنے کی کوشش کیجئے کہ ہمارے ہاں کی ہر نظم کا جامع اور لبیط عنوان ہماری غزلوں کے گرانبہا سرمائے سے بخوبی منتخب کیا جا سکتا ہے۔ غزل کی بنیادیں بہت گہری ہیں۔ اس کے امکانات وسیع ہیں، اس کا اجمال بے مثل ہے۔ غزل کی "بے زکان گردن مار دینے" سے بہتر یہ ہوگا، کہ اس کی نشاۃ الثانیہ کو قوی بنایا جائے، کیونکہ غزل زندگی اور اس کے ماحول کی تمام خصوصیات کو اپنے اندر سمو کر ایک نہایت دل ربایانہ انداز میں، ہمیشہ، ہر دور میں لطیف، خیال افروز اور پائدار ادب پیدا کر سکتی ہے!

(۴)

دورِ جدید کی خوفناک حقیقت پسندی نے غزل کے بعد بلکہ غزل کے برابر ہی غنائی شاعری کو سخت نقصان پہنچایا ہے اور اس کو زندگی کے حقائق سے فرار گردانا ہے' حالانکہ خود رومان زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے' اور حقیقت پسند

حضرات غنائی شاعری کو مطعون قرار دے کر خود ہی ایک بہت بڑی حقیقت سے فرار کے مرتکب ہو رہے ہیں، دھڑ دھڑ جلتے ہوئے روم میں نیرو کا بانسری بجانا واقعی انتہا درجہ کی حقیقت فراموشی اور نادانی ہے، لیکن طیش میں آکر بانسری کو سپرد آتش کر دینا بھی تو کچھ کم نادانی نہیں، روم ہمیشہ تو نہیں جلتا رہے گا، اور پھر زندگی میں کئی بلکہ اکثر لمحات ایسے بھی آئیں گے، جب ہمیں ہتھوڑوں اور کدالوں کی جگہ بانسری کی طرف رجوع کرنا ہو گا، اور ہمیں پھولوں اور شبنموں گالوں اور گلالوں کی جستجو ہو گی۔ ان دنوں غنائی شاعری سے فرار جاری ہے، فرار کرنے والوں کی نیک نیتی پر کوئی شبہ نہیں، لیکن مجھے خوف ہے کہ اگر یہ فرار چند برس اور جاری رہا، تو شاعری ختم ہو جائے گی، اور نظم کی کتابیں پولٹیکل سائنس، اقتصادیات اور معاشی نصابوں کی جگہ لے لیں گی، یہاں غنائی شاعری سے میرا مطلب تفریحی شاعری نہیں، ماسٹر رحمت کی غزلوں اور اختر شیرانی کی نظموں میں بڑا فرق ہے۔ غنائیت تفریح نہیں اور اگر تفریح کا عنصر شامل کرنا ناگزیر ہے، تو اس کے علاوہ یہ ایک گہری گمبھیر اور عالمگیر سچائی کا مرقع بھی ہے۔

جو شعر جولانی شباب سے محروم ہو وہ سوائے شعر کے سب کچھ ہو سکتا ہے، غنائیت سے لبریز نظموں کا طرۂ امتیاز زندگی کی حرکت اور زندہ رہنے کا ولولہ ہے۔ اور زندگی اور عزم زندگی کو کون حقیقت پسند نفرت کی نظروں سے دیکھنے کی جرأت کر سکے گا۔ دراصل محبت اور حقیقت کا تضاد غیر فطری اور بے محل ہے۔ محبت کا جذبہ داخلی ہونے کے باوجود اجتماعی اور اس لئے آفاقی ہے، اور کوئی آفاقی جذبہ زندگی سے بعید نہیں ہو سکتا۔

درد و کرب کے علاوہ لذت و کیف بھی تو زندگی کے عناصر ہیں اور پھر عشق ایک سچائی ہے۔ حسن پرستی ایک عالمگیر جذبہ ہے، سپردگی اور مغلوبیت حقائق حیات میں شامل ہیں، خصوصاً جب اس سپردگی میں لوچ اور اس مغلوبیت میں لچک ہو، اور ساتھ ہی جب یہ جذباتی سپردگی و مغلوبیت زندگی کی طہارت کی بنیاد بن جائے۔

غنائی شاعری پر سب سے بڑا الزام یہ دھرا جاتا ہے، کہ اس میں انسانی جسم کا ذکر بار بار آتا ہے۔ میں تفریحی اور غنائی شاعری کے تفاوت کے متعلق پہلے عرض کر چکا ہوں، عورت یا مرد کے جسم کو شاعری کی بارگاہ سے ہمیشہ کے لئے خارج کر دینا ایک بھیانک کوشش ہے، ہم پرچھائیوں اور سایوں کے متعلق نہیں لکھتے، ہماری پرانی مثنویوں میں غیر مرئی اجسام کے متعلق کیا کم لکھا جا چکا ہے، کہ ہم بھی اب نئی بکاؤلیوں کی تخلیق میں عمریں گزار دیں۔ البتہ جسم کا احترام لابدی ہے، اور سلجھے ہوئے غنائی شاعر ہوس اور محبت کا فرق بخوبی محسوس کرتے ہیں، یہاں میرے مخاطب وہ "نفسیات زدہ" حضرات نہیں، جن کے سر احساس لطیف پر مغربی اساتذہ کے اقوال کے مطابق جنسیت غالب آ چکی ہے، دراصل حقیقت پسندوں کو غنائی شاعری کے متعلق اپنے نظریے میں ترمیم کرنی چاہیئے، کیونکہ اس کی مخالفت سے وہ بزعم خود جو انسانی خدمت انجام دے رہے ہیں، وہ حقیقت میں ایک شدید نوعیت کی جنسی گھٹن اور ذہنی آوارگی کی تمہید ہے۔

(۵)

اردو میں نظیر اکبر آبادی کے بعد حالی نے نظموں کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی۔ اگرچہ انیس و دبیر مرثیہ کی

صورت میں نظم کے لئے زمین تیار کر چکے تھے۔ مگر حالی نے روزمرہ محاورہ، زبان کے چٹخارے اور رعایت لفظی سے جھلکتی ہوئی غزلوں سے گونجی ہوئی فضا میں ایک نئی آواز بلند کی، جسے لوگوں نے چونک کر سنا، اور بلانے والے کی فطری پاکیزگی اور خلوص سے بھرے ہوئے پیغام پر کان دھرے، جہاں حالی کی آواز ختم ہوئی، وہاں سے اقبال نے ایک اور صدا بلند کی، اس صدا میں ایک زندہ طنطنہ اور جاندار دبدبہ تھا، یہ صدا حالی کی آواز سے مختلف تیز اور رسیلی تھی، اس میں حالی کے مصلحانہ اور واعظانہ اندازِ تخاطب کا شائبہ تک نہ تھا، اقبال کی زندگی ہی میں جوش نے ایک نیا نعرہ لگایا، یہ نعرۂ انقلاب تھا، اگرچہ جوش کی ابتدائی نظموں میں یہ انقلاب توڑ پھوڑ اور گرجنے برسنے کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا، لیکن آگے چل کر جوش نے انقلاب کا ایک انفرادی نظریہ پیش کیا، اور تخریب کے فوراً بعد ہی تعمیر کے نکات سے بھی اپنی نظموں کو مزین کیا۔ نوجوان طبقہ جوش کے نعروں کی گونج کو لے اڑا، اور ایک ایسی شاعری کو رواج دیا جس نے ایک عرصہ تک اردو کے کئی ہونہار شعرا کی توجہات کو سمیٹے رکھا۔ شاعری ایک نقطے پر جم گئی، نوجوانوں کو صداقت کا ایک ذرّہ ملا اور اسی کو مجسم صداقت سمجھ بیٹھے — طعن و تشنیع کا ایک طوفان اسی ایک مرکز پر بگولے کی طرح چکر کاٹتا رہا، اور سمجھنے بوجھنے والے حیران رہے، کہ اردو شاعری پر سے اس افتاد کو کیسے ٹالا جائے، آخر نئے شعرا کا ایک پڑھا لکھا طبقہ جسے نفسیاتی، تاریخی اور جدلیاتی باریکیوں کا پورا پورا شعور تھا، آگے بڑھا، اور اس کف در دہاں گروہ کو ایک ایسی راہ پر ڈالنے میں کامیاب ہو گیا، جو انہیں کھنڈروں سے نکال کر کھلی دنیا میں لے آئی جہاں سے آنے والے تعمیری دور کا آفتاب افق پر روشنی کا ایک نیم دائرہ سا بنا کر انہیں ہم آغوشی کی دعوت دے رہا تھا، شکر ہے کہ اس نام نہاد انقلاب کے پیغام بر اب سنبھل رہے ہیں، ورنہ کچھ عجب نہ تھا، کہ اردو شاعری تھوڑی سی مدت کے بعد دشناموں اور بہتانوں کے انبار تلے دب کر اپنی فطری لطافت کھو بیٹھتی،

انقلاب زندگی کا لازمہ ہے، تغیر ایک اٹل سلسلۂ عمل ہے۔ انقلاب کا محض انتظار کرتے رہنا بھی کوتاہ اندیشی ہے اور انقلاب کو زورِ زباں اور زورِ بازو سے قریب تر لانا انسب اور احسن ہے، لیکن سطحی وطن پرستی ہمیں کہیں نہ لیجا سکے گی یہ ایک عجیب بات ہے کہ عموماً ہمارے ہاں ؎

حل کرتا ہے افلاس کے عقدے وہ سخنور
جو ہاتھ میں تھامے ہوئے سونے کا قلم ہے

یہ صرف ایک عجیب بات ہی نہیں ایک دردناک حقیقت بھی ہے کہ جن لوگوں کی زبان سے ہم موجودہ نظام کو یکسر بدل ڈالنے کے آتشیں تقاضے سنتے ہیں وہی دراصل اس نظام کی بقا کے ذمہ دار ہیں، مزدوروں اور کسانوں کے ہمدرد خود بہت بڑے بڑے جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں جن لوگوں کو مزدوروں کے شام کے کھانے کی فکر مارے ڈالتی ہے وہ شام ہوتے ہی خود کیسی کیسی ضیافتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور کیا کچھ کھاتے پیتے ہیں۔ اس کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنا بے کار ہوگا۔ زندگی کے بحرِ ذخار کے ساحل پر کھڑے ہو کر ڈوبنے والے پر رحم کھانا

نہ ترقی پسندی ہے اور نہ انقلاب ہے۔ کسی کا رحم حاصل کرنا کسی سے ایک لقمہ روٹی پانے سے کچھ کم ذلت نہیں اور ہمارے نئے شاعروں کے اوّلین قافلہ میں اکثریت ایسے ہی "بخشش" کرنے والے لوگوں کی ہے جو جاگیردار نہیں تو جاگیردار کے نورِ نظر ضرور ہیں یا جن کی آمدنیوں نے انہیں سرمایہ داروں کا مثنیٰ ضرور بنا رکھا ہے۔ یہ بری بات نہیں، اچھا رہن سہن ہی تو ہمارا مطمحِ نظر ہے۔ لیکن ہمارے درمیان ٹالسٹائے ایسا جاگیردار ابھی تک کوئی نہیں اٹھا۔ اور ہمارے جن انقلابیوں کی جیبیں بھری جاچکی ہیں۔ وہ یہ کہہ کر الٹے قدم پیچھے ہٹ گئے ہیں کہ بس اب ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے!

دراصل انقلابی اور حکیمانہ شاعری کرنا اتنا آسان نہیں جتنا عام طور سے سمجھ لیا گیا ہے انقلابی شاعر کا ذہن جب تک ایک خاص مسئلے کو توجہ کی مرکزیت اور یکسوئی سے نہ پرکھ سکے۔ وہ پیغامی شاعری کا خالق نہیں بن سکتا، عصریتی نقطۂ نگاہ حیات کے منافی ہے، سچائیوں کی ہوبہو ترجمانی کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن سچائی کی ایک بہت بڑی خصوصیت خوبصورتی بھی تو ہے اگر ہر شعبۂ زندگی میں ہم سب کا ایک جمالیاتی نقطۂ نظر ہو تو ہم زندگی سے قریب رہتے ہوئے بھی ذہنی ژولیدگی اور عملی جمود سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور ہمارے ہاں انقلابی شاعری نے شروع ہی سے جو صحافتی رنگ اختیار کر لیا ہے، وہ حقیقت کے عمیق اور فنی مطالعہ سے اس جمالیاتی احساس میں بدل سکتا ہے جس پر ہر فنِ لطیف کی بنیاد ہے، جس میں خود ضبطی ہے حقیقت پناہی ہے انسانیت ہے۔

یہ جذبۂ تخریب، یہ صحافتی طرزِ بیان اور یہ غم و غصہ ہماری برسوں کی محکومی کا جذباتی اور حسیاتی ردِ عمل ہے لیکن جب تک آئندہ کی تعمیر کا ایک منضبط لائحہ عمل ہمارے سامنے نہ ہو۔ ہم صرف تخریب سے انسانیت کی کوئی نمایاں خدمت انجام نہیں دے سکیں گے، موجودہ زمانہ عالمِ انسانیت کا اہم ترین زمانہ اور بین الملی مؤثرات کے لحاظ سے تاریخ کا نازک ترین دور ہے سمٹے ہوئے حقائق نے پھیل کر ساری دنیا کو محیط کر لیا ہے، اب جب ہم اپنے متعلق سوچتے ہیں تو غیر محسوس طور پر سارے عالمِ انسانیت کے متعلق سوچ رہے ہوتے ہیں، جب انڈونیشیا آزاد ہوتا ہے تو دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک محکوم قومیں اپنے سفید فام آقاؤں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئے تڑپ اٹھتی ہے۔ جب امریکہ اپنے یومِ آزادی کی تقریب پر جزائر فلپائن کو (ایک بخشش ہی کی حیثیت سے سہی۔) آزادی دیتا ہے تو دنیا کے تمام سمندروں میں بکھرے ہوئے محکوم جزائر آتش فشاں پہاڑوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر حصولِ حریت کا لاوا کھولنے لگتا ہے۔ اب لڑائیاں شہروں کی فصیلوں پر نہیں ہوتیں، کرۂ ارض کے مشرق سے لیکر مغرب تک ایک ہولناک محاذ کھل جاتا ہے جو سمندروں اور ہواؤں کی رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور پھر سالماتی قوتوں کے بے پناہ امکانات نے تو ہمارے عمروں کے مقررہ عقاید اور نظریات کی کایا پلٹ دی ہے اب ہیجانی اور سیلابی انداز کی شاعری کا زمانہ گزر چکا ہے اور وسیع تر حقائق ہمیں چار طرف سے گھور رہے ہیں۔

انقلابی شاعروں کی ایک خصوصیت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ انہیں خدا سے کیوں بیر ہے۔ اگر مذہب کی ابتدائی یعنی حقیقی ماہیت کو پرکھا جائے تو یہ ایک ایسے کیمیاوی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ہماری زندگی کو درندگی سے مٹا کر انسانیت کا احترام اور اپنی ذات کی طہارت سکھاتا ہے، مذہب اگر خود فکری نشو و نما

میں کسی نوع کی مزاحمت کرسکتا — تو مذہب، مذہب نہ رہتا، فاشستی احکام کا پلندہ بن کر رہ جاتا۔ مذہب ہمیں بداخلاقی
ذہنی آوارگی اور انسانیت دشمنی کی یقیناً اجازت نہیں دیتا اور اگر خود فکری و خود شناسی ہر نوع کی آزاد خیالی پر مبنی ہے تو
پھر الحاد بھی تو خود فکری کا کوئی قابلِ فخر نتیجہ نہیں مادہ کی قوت مسلم! لیکن مادہ کی تکوین و تعمیر کے پس پردہ جو ایک غیر محسوس
حسن کارفرما ہے اس سے ایک سچا شاعر قطعاً منکر نہیں ہوسکتا اور شاعری کا سب سے بڑا معجزہ عالمگیر حسن کا احساس ہے

الحاد کی گرم بازاری ہمارے ہاں صحیح فکری شاعری کی کمی کا نتیجہ ہے۔ ہمارا ذہن ہماری ہر حرکت کی اولین تخلیق گاہ
ہے۔ جنس ہو یا انقلاب، مذہب ہو یا الحاد ہم ہر حالت میں اپنے ذہن کی رہنمائی کے محتاج ہیں اور فکری شاعری ہی ہماری
ذہنی تربیت میں صحیح طور پر معاون ہوسکتی ہے، ذہنی تربیت کا مسئلہ ایک نہایت اہم اساسی مسئلہ ہے اور خدا کا شکر
ہے کہ اقبال نے دوسرے کئی احسانات کے ساتھ ہمارے ہاں فکری شاعری کو رواج دے کر ہم نوجوانوں کے سامنے
امکانات کی وسیع شاہراہیں کھول دی ہیں

لیکن یہاں ایک دردناک حقیقت کا اعتراف ضروری ہے، ہم ہندوستانی دنیا کے نسلی سماجی اور سیاسی حلقوں
میں اپنے رنگ کے سانولے پن، اپنی رواج پرستی اور محکومی کے باعث ساری دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے نزدیک
نہایت پست ذہنیت کے مالک ہیں، ایک ہندوستانی امریکہ اور انگلستان کے سفید فاموں کی نظروں میں صرف
اس لئے اچھوت ہے کہ اس کے چہرے کا رنگ آب وہوا کی ستم ظریفی اور چند ناگزیر جغرافیائی حالات کے باعث
گورا چٹا نہیں۔ افریقہ میں محض اس کی سیاہ فامی کے مدِ نظر گھیٹو بل پاس کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں اس کا داخلہ ممنوع ہے
لندن کے ہوٹلوں اور رقص گاہوں میں انگریز بیرنوں کے ساتھ ان کے کتوں کو اندر جانے کی اجازت ہے۔ مگر ایک بڑے
سے بڑا ہندوستانی بھی وہاں اپنا سایہ تک نہیں ڈال سکتا۔ ہم ہندوستانیوں کو قدم قدم پر ایک عالمگیر تضاد کا سامنا ہے
اور یہ تضاد زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے اس عالم میں ہم وہ ذہنی یکسوئی، وہ توجہ کی مرکزیت، وہ خیال کی تعمیری نوعیت
کہاں سے لائیں، جو صحیح پیغامی اور فکری شاعری تخلیق کرتی ہے۔ ہماری سماجی بوالعجبیاں اب ادب میں بہت کچھ اجاگر
ہو چکی ہیں، غریب اور امیر کی سماجی حالت میں جو بعد القطبین ہے وہ ایک ہموار زندگی کے تصور ہی کو جڑ سے کتر ڈالتا ہے
اور سیاست؟ سیاست میں ہماری حالت حد درجہ مضحکہ انگیز ہے۔ ہم نے نام نہاد جمہوری قوتوں کی بقا کے لئے دنیا کے
ہر محاذ پر جانیں لڑا دیں مگر جب یہی جمہوری قوتیں ہماری ٹڈی دل افواج کے بل بوتے پر فاشستی قوتوں کو شکست
دے چکیں تو اپنی نمائشی جمہوری کینچلی اتار پھینکی اور استبداد کا خون آلود جبڑا صاف نظر آنے لگا۔ استبداد ہارا، استبداد
جیتا اور محکوم بدستور محکوم رہے۔ وزیر اعظموں کی تقریریں اور پریزیڈنٹوں کے وعدے سب پادر ہوا ثابت ہوئے،
انسانیت اپنے زخم رفو کرنے کی کوشش میں اپنے خون کے دریا بہا بیٹھی اور استبداد و استعمار کے بھتنے بلندیوں
پر بیٹھے خون آلود پنجوں کو چاٹتے رہے۔ اس حالت میں ہندوستانی ادیبوں کا غم و غصہ فطری ہے۔ لیکن میرا مقصد محض
یہ ہے کہ صرف ماتمی بن کر رہ جانا اور انسانیت سوز طرزِ حکومت کو ختم کرنے اور نیا نظام تعمیر کرنے کی طرف متوجہ
نہ ہونا اپنے آپ پر ظلم ہے، آنے والی نسلوں پر ظلم ہے، اپنی تہذیب و ثقافت بلکہ اپنی آدمیت پر ظلم ہے۔ ہم اگر

ذہنی افراتفری کے شکار ہو کر رہ جائیں تو ہماری ادبی برتری محض ہنگامی ہو گی۔ شاعر انسان ہونے کے باوجود عوام سے بلند حیثیت رکھتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ایک اعلیٰ انفرادیت پیدا کر کے اپنے آپ کو کائنات میں یوں مدغم کر دیں کہ ذات مکمل رہے مگر ذات اور کائنات کا فرق نہ پہچانا جا سکے۔ اس طرح ہم نہ صرف نژادِ نو کے لئے ایک ایسی شاہراہ تیار کر جائیں گے جس پر چل کر ہماری نسلیں کانٹے چننے اور رویدگی کاٹنے میں اپنی عمریں نہ بتا دیں گی بلکہ ایک ہموار رفتار سے اپنی منزل کو پا لینا ان کا مقصودِ حقیقی ہو گا۔

ہم اس ہنگامہ زار میں اپنے آپ کو بلند رکھ کر اور اس کے پیچ وخم میں سے آزاد ہونے کی راہیں سجھا کر اور کچھ نہیں تو چند اثرات کی تخلیق ضرور کر جائیں گے، اور اثرات کے معجزات ہی سے تو انسانی ارتقا کا سلسلہ رواں دواں ہے، ساتھ ہی ہمیں اپنی جانفشانیوں کی بیرونی داد کا محتاج نہیں رہنا چاہیئے، خود اعتمادی بڑی چیز ہے اور ہمیں یقین کر لینا چاہیئے، کہ اثرات کا عمل ایک پر سکون عالم میں ہوتا ہے، عوام کی اکثریت کو اس تغیر کا ہلکا سا احساس بھی نہیں ہوتا، اور نسلوں کے بعد اچانک لوگوں پر یہ راز کھلتا ہے، کہ ہائیں! انقلاب فرانس کے اولین داعی تو روسو اور والٹیر تھے۔ اور انقلاب روس کے لئے تو عوام کے اذہان کو پشکن، چیخوف اور ٹالسٹائے برسوں پہلے تیار کر چکے تھے، روماں رولاں کا قول ہے:۔

"جو ظلم ہوتا دیکھے اور اس کے خلاف جہاد نہ کرے خود بھی ظالم ہے، وہ عقل وفکر جو عملی صورت اختیار نہ کرے عقل کی غداری اور فکر کا اسقاط ہے۔"

اپنے ماحول سے قطعی طور پر الگ ہو رہنا اور زندگی کو ایک ایسا خواب بنا لینا جس میں انسان بستے ہی نہ ہوں شاید اپنی جگہ کوئی لطیف چیز ہو، مگر اپنی انسانیت سے غداری ضرور ہے، لیکن ہمیشہ کی طرح یہاں بھی ایک مشکل ہمیں گھور رہی ہے، اور وہ ہے عوام کی شاعری! آنے والے انقلاب کے لئے ہم پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں کو ضرور تیار کر سکتے ہیں، لیکن انقلاب کی ریڑھ کی ہڈی ہماری کوششوں سے غیر متاثر رہتی ہے، عوام ہماری تمام کاوشوں سے بے بہرہ محض رہتے ہیں، میرا ذاتی خیال ہے کہ اُردو زبان کا پنجابی شاعر، پنجابی عوام کیلئے شاعری نہیں کر سکتا، یہ اس کے بس ہی کی بات نہیں۔ کئی حضرات یہ الفاظ پڑھ کر اُردو کی ہندوستان گیر مقبولیت کو معرضِ خطر میں پائیں گے، مگر یہ حقیقت ہے کہ پنجاب کے عوام کو پنجابی زبان کے شاعر اور ادیب ہی بیدار کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی پنجاب ہو یا بنگال، اودھ ہو یا دکن ہمارے عوام کی تعلیم و تربیت ابھی اتنی پیچھے ہے، کہ وہ ادب کی قدر ہی نہیں کر سکتے، عوامی شاعری کے سلسلہ میں سوائے مطلبی فرید آبادی کے کسی اور شاعر نے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی، مگر ایک عجیب بات ہے، کہ مطلبی کی نظمیں بھی مشرقی پنجاب کے دو تین اضلاع اور دہلی کے مضافات سے آگے نہیں نکل سکیں، بیان کے بجائے اس میں زبان کا کوئی ایسا نکتہ ہے، جس کو "زبان دان" حضرات مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں،

(۶)

مواد اور ہیئت کے لحاظ سے اردو شاعری کا نیا دور نت نئے تجربات سے معمور ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب مغرب و مشرق کے ڈانڈے ملنے لگے، اور دنیا کے ہر سیاسی اور سماجی مسئلے کو بین الملی نقطۂ نگاہ سے پرکھا جانے لگا تو ہماری عشق و محبت اور تصوف سے لبریز شاعری پر وطنیت، انسانیت، فلسفہ، سائنس، سیاسیات وغیرہ غرض ہر شعبۂ حیات اپنا عکس ڈالنے لگا اور ہر مدرسۂ فکر نے ان نئے موضوعات کو اپنے ماحول کے پس منظر پر اپنے انفرادی اسلوب سے اجاگر کرنا شروع کیا۔ مدتوں کی مقررہ اقدار میں ناقابلِ تصور تغیرات رونما ہونے لگے، اخلاق کے معین معیاروں میں رد و بدل ہونے لگا، وہ شرافت جو محض امارت سے عبارت تھی۔ اب ریاکاری اور انسان کشی سے تعبیر کی جانے لگی، کئی حقیقتیں دروغ گوئی کا لباس پہن کر سامنے آئیں، پالیسی نے مصلحت کی صورت اختیار کر لی اور احساسات کے سکون زار میں بھونچال سا آ گیا۔

مواد کے تغیر اور وسعت نے ہیئت میں بھی تبدیلیاں کیں، پہلے غزل کی سی ہیئت کی نظمیں وجود میں آئیں، پھر مثنوی کے رنگ کا رواج پیدا ہوا، الگ الگ ہم قافیہ بند تراشے جانے لگے، قوافی کی پابندیوں کو ہلکا کیا گیا، ردیف سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی گئی، سانٹ لکھے جانے لگے، غیر ملکی زبانوں کی منظومات کے منظوم تراجم شائع ہونے لگے اور پھر اچانک نظمِ معریٰ اور نظمِ آزاد کی چٹان ایک زبردست گرج کے ساتھ تجربات کے اس خاموش سمندر میں گری، اور سطح پر اٹھتی ہوئی ننھی ننھی لہروں کو کوہسار آسا موجوں میں بدل دیا۔ جن لوگوں نے ان نئے تجربات سے اپنے مذاق کو کلی طور پر ہم آہنگ نہ پایا، انہوں نے قوافی کی پابندی کو تو نہ چھوڑا، مگر بندوں اور ان کے اشعار کی مقررہ تعداد کی تمام قیود اٹھا دیں، لیکن کوئی معقول رہنمائی نہ پا کر تمام اردو شاعری ہیئت کے لحاظ سے بالکل گڈمڈ ہو گئی، اب حالت یہ ہے، کہ پابند اور آزاد نظموں کے مابین نیم پابند اور نیم آزاد نظموں کا ایک طومار ہے، جو بے یقینی اور عدم خود اعتمادی کے باعث ڈانواں ڈول عالم میں کبھی ادھر جھک جاتا ہے، اور کبھی ادھر پلٹ جاتا ہے۔ اکثر شعراء نظم کی ہیئت کو ایک بالکل فروعی بلکہ قطعی بے کار پابندی سمجھ کر من مانی آزادیاں برت رہے ہیں، اور ہر نئی لغزش کو تجربے کا خوبصورت نام دیا جا رہا ہے۔ تجربات کی اہمیت سے فلسفۂ ارتقا کے کسی طالب علم کو انکار نہیں ہو سکتا، مگر ہر تجربہ جب اول و آخر تجربہ ہی رہے تو تجربہ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، ایک تجربے کو ضغطے کے عالم میں چھوڑ کر نئے شعرا نئے تجربات کے پیچھے بھاگے پھر رہے ہیں۔ ان گنت نامکمل تجربات بے ڈھنگی لگدوں کی طرح شاعری کے لالہ زار میں ابھرے کھڑے ہیں، اور کوئی ایسا مردِ مجاہد نہیں اٹھا جو ان بکھری ہوئی چٹانوں کو جمع کر کے ایک سرسبز کہسار کی صورت میں اس لالہ زار کے کنارے کھڑا کر دے، تاکہ یہ منظر کی دلکشی میں اضافے کا باعث ہو سکے۔

نظمِ آزاد اور نظمِ معریٰ کا میں مخالف نہیں ہوں، بلکہ اس کے وسیع امکانات کا قائل ہوں، مگر قافیے سے خدا واسطے کا بیر میری سمجھ میں نہیں آتا، نہ جانے ہمارے بیشتر فن کاروں اور نقادوں کے ذہنوں میں عصبیت نے

کیوں پنجے گاڑ دیئے ہیں۔ نظم کا معترف ہونے کے لئے غزل کو مطعون ٹھیرانا ضروری نہیں، انقلابی خیالات کو ترویج دینے کی سعی میں غنائیت کی جڑیں کاٹنا بے معنی ہے، آخر جب آزاد شاعری کی وکالت کی جاتی ہے، تو قافیہ کو کامل طور پر ترک کر دینے اور اسے بارگاہِ شعر سے خارج کر دینے پر اتنی قوتیں کیوں صرف کی جاتی ہیں، درحالیکہ غزل اور غنائی شاعری اور قافیہ اور ردیف کا دستور نظم کی ترقی اور آزاد شاعری کے رواج میں حارج نہیں ہو سکتا ہر صنف اور ہر مد کی چند خصوصیات ہیں، جو اس کی زندگی کے عمل و حرکت کا ثبوت بھی ہیں اور تقاضا بھی، اور پھر صرف ہیئت کا اجتہاد کوئی بہت بڑا کارنامہ نہیں، اگر ہم ہر جدت کو اجتہاد کے مقدس نام سے یاد کرنے لگیں، اور اپنے حسنِ امتیاز اور قوتِ فیصلہ کو بروئے کار نہ لائیں، تو ادب میں اچھے برے اور پائدار و ناپائدار کی تفریق ہی ختم ہو جاتی ہے کیوں نہ عالی ظرفی اور وسیع النظری سے کام لیا جائے، پابند اور آزاد شاعری کے محاسن کو الگ الگ پرکھا جائے۔ اور اگر دونوں میں خلاق شاعری کے نمونے مل جائیں تو دونوں کو برداشت کر لیا جائے نظمِ آزاد ہم ہندوستانیوں کے لئے بالکل نئی چیز نہیں، پرانی آریائی شاعری کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں، کہ یہ طرزِ اظہار ہمارے ہاں نہایت قدیم سے رائج ہے۔ ساتھ ہی پابند شاعری ہی کی وجہ سے ہمارے ادب میں وہ تازگی اور لہلہاہٹ ہے، جو اب تک آزاد شاعری میں پیدا نہیں ہو سکی۔ لیکن جس کا امکان ضرور ہے۔

ذاتی طور پر میں نے اب تک مقررہ اسالیب بیان سے کوئی قابلِ ذکر انحراف نہیں کیا، ہیئت کی تبدیلیاں مروجہ اسالیب بیان سے عدم اطمینان کے نتائج ہیں، اور میں نے اب تک اپنے تخیلات و تصورات کے کماحقہٗ اظہار میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کی، میں نے چند آزاد اور معریٰ نظمیں بھی کہی ہیں، جو جلال و جمال میں شامل نہیں۔ کیونکہ ان کی حیثیت محض ایک تجربہ کی تھی میں نے محسوس کیا ہے، کہ انہیں موضوعات کو میں پابند نظموں میں زیادہ رواں، مترنم اور بولتے چالتے انداز میں پیش کر سکتا ہوں۔ عین ممکن ہے کہ آگے چل کر میرے ذہن میں کوئی ایسا موضوع جنم لے، جو پابند شاعری میں نہ سما سکے (کیونکہ پابندی بہر حال پابندی ہے) اور مجھے نظمِ آزاد کی پناہ ڈھونڈنی پڑے جب ایسا موقع آیا، تو میں آزاد نظم کہنے سے قطعی اجتناب نہیں کروں گا، ویسے میرا یہ پختہ یقین ہے، کہ طویل نظموں کے لئے مثنوی بھی دور تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ ان کے لئے بلینک ورس کے سوا کوئی اور اسلوب مشکل ہی سے پنپ سکے گا۔ ہماری زبان میں طویل نظموں کا افسوسناک فقدان ہے، اور اس کمی کو پورا کرنے کے لئے صرف نظمِ معریٰ ہی ہمارا بہترین ہتھیار ثابت ہو سکتی ہے آزاد نظم کی مخالفت زیادہ تر اس خیال کے ماتحت کی جا رہی ہے، کہ یہ یورپ کی صنفِ سخن ہے، اس لئے ایشیا کے مذاق سے اس کا کوئی میل نہیں، یہ اعتراض بہت حد تک غلط اندیشی پر مبنی نظر آتا ہے اول تو جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، آزاد نظم ہندوستان میں صدیوں پہلے پھلی پھولی، دوم اگر اس اعتراض کو کچھ دقت کے لئے درست مان لیا جائے تو ہندوستان میں شاعری کا وہ کونسا دور ہے جس میں کسی نہ کسی غیر ملک کی اصنافِ سخن کی پیروی نہیں کی گئی، ہندوستان کے اصلی باشندوں کی شاعری کو آریاؤں نے بدلا، آریا لوگ ہندوستان کے باشندے بن گئے، مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو شاعروں کی شاعری میں ہندوستانیت تھی، جو آریوں کے اثر سے اس

صورت تک پہنچی، مسلمانوں کے آنے کے بعد اور خصوصاً مغلوں کے زمانے میں تمام فنونِ لطیفہ میں ہندوستانیت آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی اور اس کی جگہ "ایرانیت" اور "ترکیت" نے لے لی یعنی پہلے فنونِ لطیفہ آزاد تھے، اب فارسی و عربی کے غلام بن گئے، خالص ایرانی اور ترکی علاماتِ شاعری ہمارے ادب میں گھر کرنے لگیں ــــ ایسی علامات جن میں سے اکثر کو تو ہمارے ہندوستانی فن کاروں نے دیکھا تک نہ تھا، اب انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہم پر انگریزیت کا غالب آجانا ضروری تھا، آزاد نظم کو کچھ وقت کے لئے اگر سیاسی غلامی کی نشانی سمجھ لیا جائے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ غزل کس دورِ حریت کی یادگار ہے، یہ بھی تو ایک بدیشی صنفِ سخن تھی، اس کا سارا ہیئتی نظام بدیشی تھا، اس کی تراکیب و علامات بدیشی ہیں، لیکن اس کی جڑیں ہماری سماجی زندگی کے پاتال تک جا چکی ہیں، کیا عجب ہے کہ اسی طرح آزاد نظم بھی ہمارے مستقبل کا ایک گرانبہا کارنامہ ثابت ہو سکے۔

لیکن یہ بہت بڑا ظلم ہے، کہ نظم کی صورت بھی ایک لحاظ سے نئی اور مغربی ہو، اور اس میں خیالات بھی اجنبی یعنی مغربی رنگ کے ٹھونسے جائیں، (غزل کی چند معلوم خامیوں سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیئے تھا) اور پھر گنتی کی چند مستثنیات کو چھوڑ کر باقی تمام شعراء مہمل گو ثابت ہو رہے ہیں، وہ اس کی آزادیوں سے فائدہ اٹھانے کی دھن میں بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں، مگر کچھ بھی نہیں کہہ سکتے، لشتم پشتم چند تراکیب کو جوڑا، الم غلم فقرات تراشے اور مصرعوں کے ارکان کے خیال تک کو آزادی کی بھینٹ چڑھا دیا، یہ لوگ حقیقت میں آزاد نظم کی جڑوں پہ کلہاڑا چلا رہے ہیں، ہیئت کا اجتہاد بری بات نہیں، لیکن مواد کے مقابلے میں تو ہیئت کی حیثیت قدیم و جدید تمام رنگوں کے حضرات کے نزدیک ثانوی ہے، آزاد شاعری میں ہمیں مروجہ موسیقی کے اصولوں سے روگردانی کرنی پڑتی ہے (اگرچہ ہماری موسیقی بھی بتدریج اجنبی اثرات کے بوجھ تلے دبتی اور بدلتی رہی ہے) اس نقصان کی تلافی بھی ہو سکتی تھی، اگر آزاد نظمیں کہنے والے مواد میں اجتہاد کرتے، یا اگر ان کے پاس نئے موضوعات نہ تھے، تو پرانے موضوعات کو نئے انداز میں اس طرح پیش کرتے، کہ اشاریت کی دھن میں ابہام اور بالآخر ابہام کے بھنور میں نہ پھنس جاتے، نیز دو مصرعوں کے غیر شعوری طور پر ہم قافیہ ہو جانے سے بدک نہ اٹھتے، بلکہ تاثیر اور راشد کی طرح اس خوشگوار اتفاق کو قبول کر لیتے، کہا جاتا ہے، کہ نئی نظموں بلکہ اکثر نئی کہانیوں کا ابہام دورِ جدید کی الجھنوں کا عکس ہے، اور جب تک یہ نظام نہیں سدھرے گا، اردو ادب و شعر میں ابہام موجود رہے گا، کاش اس نوع کے سطحی خیالات ظاہر کرنے والے حضرات شاعر کی حیثیت پر غور کر سکتے، اور اندازہ فرما سکتے، کہ شاعر انسان ہونے کے باوجود عام انسانوں سے فکری لحاظ سے بلند ہے، وہ نازاں ہے کہ وہ ہل چلانے والوں اور پتھر کوٹنے والوں کا بھائی ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی ذہنیت بھی ان بھائیوں کی سی بنا لے تو وہ شاعر نہیں رہے گا محض تک بند اور بھاٹ بن کر رہ جائے گا، شاعر اپنے دور کی الجھنوں کا عکس ضرور پیش کرے، لیکن ان الجھنوں میں الجھ کر نہ رہ جائے، وہ اس انتشار و اختلال سے خود نکلے اور دوسروں کو نکالے، اشاریت کا حسن بے پناہ ہے لیکن ابہام اور اشاریت میں امتیاز کرنے کی بصیرت نہایت ضروری ہے،

اردو میں آزاد شاعری کے متعلق ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ اس میں پچانوے فیصدی اعصابی شاعری کی گئی ہے۔ خالد کی مشہور نظم کتبہ ایسے کارنامے بہت کم انجام دیئے گئے ہیں، جو نوجوان آزاد نظم کہے گا، وہ جنس اور نفسیات جنس سے باہر جا ہی نہیں سکتا، بلند صنوبروں اور گہری گپھاؤں کو بھی جب وہ دیکھے گا، تو انہیں بعید از فہم استعاروں کے مرکز بنا کر نہایت کریہہ نوعیت کی جنسیت پر اتر آئے گا، ہیئت پابند تھی تو موضوع آزاد تھا۔ اب ہیئت آزاد ہوئی ہے تو موضوع پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

لیکن ہمیں بددل نہیں ہونا چاہیئے، نئے نئے تجربات (بشرطیکہ ہم ان سے استفادہ کر سکیں) زندگی کے تالاب کو نتھرا استمرار رکھتے ہیں، اس پر کائی نہیں جمنے دیتے، خالد، تاثیر اور راشد کی اکثر نظمیں عام آزاد نظموں کی طرح ہیجانی یا جذباتی نہیں، ان لوگوں نے سنبھل کر اور اعلیٰ جمالیاتی معیاروں کو مد نظر رکھ کر لکھا ہے۔ اگرچہ ان کے خیالات نئے ہیں، مگر ہندوستانیت اور انسانیت سے محروم نہیں، اور پھر ہر شاعر پر ایک ہی قسم کے خیالات اور تصورات کے اظہار کی پابندی تو یکسر بے معنی ہے یہاں آسکر وائلڈ کی چند سطور کو نقل کرنا بے جا نہ ہوگا:-

"وہ (عوام) ادیب سے ہمیشہ یہ پوچھتے رہتے ہیں کہ وہ فلاں ادیب کی طرح کیوں نہیں لکھتا، اور مصور سے سوال کرتے ہیں، کہ وہ فلاں مصور کی طرح تصویریں کیوں نہیں بناتا، وہ اس حقیقت سے قطعی بے خبر ہوتے ہیں، کہ اگر ادیب یا مصور میں سے کوئی ان کے مشورے پر چلے گا، تو وہ فن کار نہیں رہے گا"

انفرادی اسلوب اظہار، انفرادی پیغام، انفرادی نظریۂ فن، ادب کی ترقی اور بقا کے لئے ازبس ضروری ہے، اور تقلید اور نقالی یقیناً بے بضاعتی اور بے دست و پائی کی دلیل ہے۔

میں تو آزاد نظموں کی ترویج کو پابند نظموں کے لئے بھی ایک نیک فال سمجھتا ہوں، پرانے طرز بیان میں اشعار کی تقسیم میں، مروجہ علامات میں، خیالات تک میں ایک غیر محسوس انقلاب جاری و ساری ہے، نیز قوافی کی سختیوں کا نرم ہو جانا بھی تو آزاد شاعری کا کوئی معمولی کارنامہ نہیں، میں حیران ہوں، کہ اب تک ہم قوافی کو صوتی مناسبت سے کیوں ترتیب نہیں دیتے رہے، جب کہ قافیہ کا مقصد ہی یہی ہے، جانا اور اٹھنا کو دیکھا اور بیٹھا کا ہم قافیہ سمجھ لینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ مقام شکر ہے کہ اب جھرنے اور کرنیں، رقصاں اور جانا، کائنات اور انبساط، مربوط اور مبہوت ایسے قوافی زور پکڑ رہے ہیں۔ اور یہ آزاد نظم کا کارنامہ ہے ــــــ اگرچہ غیر محسوس ہے،

(۷)

اصلاح کا سب سے پہلا قدم خامیوں کا احساس ہے، اور دلائل کی صداقت کی طرف توجہ کئے بغیر یہ ہٹ کئے جانا، کہ ہمیں کسی کے اعتراض کی پرواہ نہیں، یا پرانے (مگر پڑھے لکھے اور خوش مذاق) طبقے کے مشورے ہماری انفرادیت کو ختم کر ڈالیں گے، طفلانہ پن ہے، ہماری شاعری میں اگر چند خوبیاں ہیں، تو اپنی خامیوں سے آگاہ ہو کر ہم ان خوبیوں کو سنوار اور نکھار سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں بہت کم فن کار ایسے ہیں، جو اعتراضات کو صبر و سکون سے

سن کر غور و فکر میں محو ہو جائیں، اور اگر انہیں نقادوں کے مشورے کلی طور پر منظور نہیں تو وہ ان میں ڈوب کر چند ایسے موتی نکال لائیں، جن کی آب اعتراضات کی گنجائش ہی نہ چھوڑے، جب تک ہمیں اپنی خامیوں کا احساس نہیں ہوگا، اردو ادبیات کا ارتقا معرض خطر میں پڑا رہے گا،

نوجوان شعراء میں علم کی کمی سب سے بڑی خامی ہے، موجودہ طریقۂ تعلیم کے بے شمار نقائص اس افسوسناک کمی کے ذمہ دار ہیں، اور چونکہ ہم محکوم ہیں، اور ہماری محکومی کچھ اس شدید قسم ہے، کہ اپنے متعلق کچھ سوچنا بھی اکثر اوقات قانون کی زد میں آجاتا ہے، اس لئے مجبور ہو کر ہم ہندوستانیوں کو ذہنی طور سے انگلستان اور امریکہ میں رہنا پڑتا ہے، حقیقی زندگی اور مطالعہ سے اخذ کردہ معیارِ حیات کی ٹکر — نیز سماجی حالات کے زبردست تضاد کو دیکھ کر ہمیں اپنے اندر چند ایسے مفروضے گھڑنے پڑتے ہیں، جو کسی سماج سے تعلق نہیں رکھتے، جن کا انداز گڈمڈ اور جن کی ترتیب مہمل ہوتی ہے، دراصل ہم مشرقیوں کو سب سے اول مشرقی علوم کی ضرورت ہے، اس کے ساتھ ہی ہم مغربی اور جدید علوم بھی حاصل کر سکتے ہیں، مگر اولیت مشرقیت کو حاصل ہے، مشرقی ثقافت اور مغربی کلچر کے تفاوت سے کون شناسا نہیں، مگر ہمارے تعلیمی مؤثرات نے ہمارے ادب سے مشرقیت چھین لی اور مغربیت یعنی اجنبیت اور اس لئے ابہام سے ہماری نظمیں پٹی پڑی ہیں، طرہ یہ کہ مشرقیت کو قدامت کے مترادف سمجھا جاتا ہے، حالانکہ ہر ملک اور ہر قوم کی چند انفرادی خصوصیات ہوتی ہیں اور انہیں خصوصیات کی بنا پر اس کی ہستی کا علحدہ تصور کیا جاتا ہے، اگر ہم مشرقیت کو سلیقے سے اپنی نظموں میں سمو سکیں، تو ہمارے فن کی آفاقیت میں بے بدل اضافہ ہو سکتا ہے، اور ہم زندگی سے اور زیادہ قریب ہو سکتے ہیں، مشرقیت سے یہاں میرا مطلب رواج پرستی اور تمدنی نوادرات کا تحفظ نہیں، بلکہ مشرقی ماحول ہے، ترقی کرتا ہوا مشرق — قدامت کی کینچلی کو اتارتا ہوا مشرق — اپنے حقوقِ خود اختیاری کے احترام میں مغربی قوتوں سے ٹکرا جانے والا مشرق — چونکا اور سنبھلا ہوا مشرق — میرے مخاطب یہاں وہ حضرات ہیں، جو مشرق کی نشاۃ الثانیہ سے مایوس نہیں، اور جنہیں یقین ہے کہ ایشیا ایک مرتبہ پھر ساری دنیا کی تہذیب و ثقافت اور علم و فن کا مرکز اور رہنما ہوگا، یہ محض خوش فہمی نہیں، یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے جس کا ثبوت ہمارا زبردست سنبھالا، ہمارا جاگا ہوا احساس اور ہمارا ابھرا ہوا جذبۂ خودی ہے،

ہر جدت کو اپنانے کی دھن بھی ہماری بہت بڑی لغزش ہے، ہر نئی چیز کو تولنے، پرکھنے سے پہلے اور اسے اپنے قومی مزاج سے ہم آہنگ بنانے سے قبل ہی اسے رواج دینے کا جنون اتنا عام ہو چلا ہے کہ اب وہ جدت بھی جو اپنے جلو میں بے شمار خوبیاں لئے ہوئے آئے، ہمارے غضبناک نقادوں بلکہ اکثر اوقات ہمارے ہمدردوں کے نزدیک بھی ایک بدعت کا جامہ اوڑھ لیتی ہے، اجتہاد کی اہمیت کے متعلق میں پہلے مفصل لکھ چکا ہوں، یہاں مجھے یہ کہنا ہے کہ جدت اور تقلید میں حدِ فاصل قائم کرنے کی کوشش کیجئے، کیونکہ ہمارے ہاں کی اکثر جدتیں مغرب کی نہایت بھونڈی تقلیدیں ہیں اور تقلید سے بڑا رجعت پسندی کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے،

انگلستان کے چند نئے شعراء کی تقلید میں اردو کے بیشتر شعراء نے نظموں کے اختصار کو بہت اہمیت دے

رکھی ہے، اجمال کا حسن اپنی جگہ بے نظیر ہے، اور غزل کا ایک ایک شعر اس اجمال و اختصار کی بہترین مثال ثابت ہو سکتا ہے، لیکن مشکل یہ ہے، کہ یہی حضرات غزل کے بھی بدترین دشمن ہیں، الفاظ اور مصرعوں کے اختصار کے حق میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے، کہ اس عمل سے نظم کے تاثر کی وحدت محفوظ رہتی ہے، میں کہتا ہوں کہ جو شخص وحدتِ تاثر قائم رکھنے کے لئے اختصار اور اجمال کو شعوری طور پر اپنائے گا، وہ نظم کا ستیاناس کر دے گا، اس طرح وہ جان بوجھ کر ایک نہایت کڑی پابندی میں محبوس ہو جائے گا، اور عین ممکن ہے، کہ وحدتِ تاثر کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں وہ ابہام کا مرتکب ہو جائے! میرے خیال میں نئی نظموں میں ابہام کی افراط انہی کوششوں کا نتیجہ ہے، وحدتِ تاثر کی اہمیت غیر متنازعہ فیہ ہے، لیکن یہ صرف اجمال کی میراث نہیں، جو شاعر طویل نظموں میں وحدت تاثر قائم رکھ سکے، وہ اس شاعر سے زیادہ کامیاب ہے، جس نے جان بوجھ کر اجمال کی پابندیوں کو اپنے خیالات و تصورات پر مسلط کر کے اپنی ساری توانیں صرف کر ڈالیں، اجمال یا ایجاز فن کے حسن کو بے پناہ دلآویزیاں مہیا کرتا ہے، فن پارے میں چٹیلا پن پیدا کرتا ہے، تاثر کو شدت بخشتا ہے، یہ سب کچھ ہے، لیکن میں اختصار کو شعوری طور پر اختیار کرنا گناہ سمجھتا ہوں، اور پھر مشرق نے تو اجمال و ایجاز کے لئے کئی خوبصورت ہیئتیں ہمیں بخشتی ہیں، دوہا، دوبیتی قطعہ رباعی، جوش اور فراق کی رباعیاں، اقبال کے قطعے اور ہندی شاعروں کے دوہے پڑھیئے، کتنی ہی بے سود موشگافیوں سے ہمیں چھٹکارا حاصل ہو جائے گا،

ہمارے یہاں مشاہدے کے سطحی پن کی شکایت بھی عام ہے، ان میں وہ عمق، وہ گہرائی، وہ گمبھیرتا نہیں جس سے مشاہدے اور عکاسی کو الگ الگ پہچانا جا سکے، اکثر شعرا کے ذہنوں میں تو زمین کا احساس ہی مر چکا ہے، جان وارڈ کے لفظوں میں :-

"...... اس دنیا اس نکتے کے متعلق نہ سوچئے اور نہ ان ادنےٰ اور غیر متعلق حقائق کے متعلق جنہیں غلطی سے تہذیب کا نام دیا جاتا ہے (تہذیب — یعنی ٹیلیریے، لاسلکی، موٹر کاریں، ڈبوں میں بند پھل، سیفٹی ریزر وغیرہ وغیرہ) بلکہ ساری زمین کے متعلق سوچئے — سارا کرۂ ارض — زمین، سمندر، ہوا، انسان اور ان کے خواب — کیا کچھ اول اول تخلیق ہوا، کیا کچھ اُگ رہا ہے؟ انسانی ہاتھوں اور دماغوں نے کیا کچھ تعمیر کیا ہے — یہ اور ان گنت دوسرے امور — کرۂ ارض کی سوچوں میں اپنے آپ کو غرق کر دیجئے، یہ زمین — زمین اور اس کی مٹی جس کے سہارے انسان زندہ ہے — پاکستان، ہرے بھرے کھیت، میووں کے باغ..... اس اچھی زمین کے متعلق بھرپور انداز میں لکھئے، یہ زمین جو انسان کو ذخائر مہیا کرتی ہے — ہزارہا ایکڑوں پر پھیلی ہوئی فصلیں، جن میں ٹریکٹر اور مشینیں چلتی ہیں، اور باغیچوں کی ننھی ننھی کیاریاں جہاں بیلچے اور کھرپے چلتے ہیں، پہاڑیاں اور وادیاں — کھلے

میدان، زرخیز ڈیلٹے، گنجان جنگل، سورج کی حدت سے چٹختی ہوئی بنجر زمینیں اور پھر
یہی زمینیں بارش کے دھندلکوں میں لپٹی ہوئی ..... چٹانیں —— لُنڈ منڈ پہاڑ برف کے
تودے، بے برگ و گیاہ صحرا، وسیع ریتیلے قطعے —— اور پھر رات اور دن، تیرگی و
نور، تضاد کا حسن —— زمین کی متنوع دلربائیاں ...... اور زمین کے ساتھ پانی
کو بھی یاد رکھو، کیونکہ پانی کا فقدان خشکی، بے رونقی اور موت ہے، سمندر اور اس کی
سبز گہرائیاں —— تنومند اور قوی سمندر —— لیکن ایک عجیب مجوبہ ماہتاب
سے جوار بھاٹا کے ذریعے متعلق ..... سمندر، جھیلیں، دریا، ندیاں، تالاب، کنوئیں اور
چشمے ......

یہ زمین —— یہ پیاری زمین —— پانی اور ہوا اور اس میں رہنے بسنے
والی مخلوقات —— انسان، جانور، مچھلیاں، حشرات الارض، روئیدگی —— تڑکا،
دھوپ، پَو —— جو کچھ تخلیق کیا گیا اور جو کچھ نمو پا رہا ہے —— تمام جذبات، دکھ اور سکھ
کے —— تمام خیالات مذہبوں اور فلسفوں کے —— وہ سب کچھ جو زمین کو عظمت
بخشتا ہے اور جو مقدس ہے —— آسمان، ستارے، کائناتیں —— مرئی اور
غیر مرئی —— لامحدود اور نامعلوم خلائیں اور ان سب میں نفوذ کرتی ہوئی قوت
جسے لوگ خدا کہتے ہیں

اور پھر خود ہمارے فراق کا شعر ہے ؎

کیا بتائیں زمین کی رفعت
بارہا آسمان پر بھی گئے

یہ ہماری زمین، یہ چاند کی محبوبہ، یہ خلا کی رقاصہ —— جسے مشرق و مغرب نے ماں کے مقدس لقب سے
یاد کیا ہے —— یہ ہمارا ازلی و ابدی وطن —— آخر ہم اس سے دور رہ کر صرف کارخانوں اور آمد و خرچ کے
حسابوں اور مردم شماریوں وغیرہ میں کیوں کھو جائیں، زمین اور ہوا اور خلا اور خلا سے پرے بے شمار دنیائیں اور ان
دنیاؤں کی بے کنار خلائیں، یہ سب کچھ انسان کا ہے، مگر ہم ورڈز ورتھ کے سکائی لارک کی طرح پرواز کرتے ہوئے
بھی زمین سے کیوں نہ وابستہ رہیں، فراق ہی کا ایک بے پناہ شعر ہے ؎

زمیں پہ ہیں قدم اور انگلیوں سے
ستاروں کو بھی چھیڑے جا رہا ہوں

یہی ربط و آہنگ ہماری انسانیت کا محافظ ہے۔
مگر صرف آسمان کو تکے جانا اور زمین سے قطعی طور پر بے تعلق ہو رہنا انسانیت کے منافی ہے۔ اور ایک ہولناک

تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ اس یونانی ستارہ شناس کے متعلق تو آپ نے سنا ہوگا جو رات کو چلتے ہوئے بھی ستاروں کی رفتاروں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ اور بالآخر ایک کنوئیں میں گر کر مر گیا تھا، اور جس کی موت کی خبر سن کر اس کی خادمہ نے کہا تھا "میں جانتی تھی کہ اس کی موت اسی طرح واقع ہوگی، کیونکہ وہ زمین کو دیکھتا ہی نہ تھا، اس کی نظریں اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ستاروں اور صرف ستاروں پر جمی رہتی تھیں" ستاروں کا حسن بے پناہ ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات ایک لمحے کے لئے بھی نہیں بھولنی چاہیئے۔ کہ راستے میں کھڈ بھی ہیں!

مشاہدے کے دوسرے پہلوؤں کا بھی یہی معاملہ ہے۔ اندھیرے کو اندھیرا اور روشنی کو روشنی کہہ دینا بلند شاعری نہیں، ہو بہو عکاسی اور بیان کی الوہی صداقت میں بہت بڑا فرق ہے۔ اور شاعری میں صرف عکاسی کام نہیں دیتی۔ یہ الوہی سچائی اس عنصر کی طرف اشارہ ہے جو ہر پائدار ادب کی بنیاد ہے اور جس سے ہماری جدید شاعری کا اکثر حصہ محروم ہے، بھونڈا پن صوری ہو یا معنوی جرم ہے، صناعت اور فن کارانہ بانکپن توانا ادب کے لئے اسی طرح ضروری ہیں۔ جیسے انسان کے لئے ہوا اور دن کے لئے آفتاب! ــــ "وعظ نہ کرو ــــ گاؤ!" یہی ہماری شاعری کا دستور العمل ہونا چاہیئے۔

ہمارے ہاں اجتماعی احساس ترقی نہیں کر رہا، تاریخی اور تمدنی ادوار اور ان کے اثرات کا شعور بہت کم ہے، روحانیت ہے ہی نہیں، اور اگر ہے تو وہ کھوکھلے اور بے روح تصوف کی صورت اختیار کر چکی ہے، محبت کی ہمہ گیری کو صرف جنس تک ہی محدود کیا جا رہا ہے، بدلتی ہوئی سیاسی و اخلاقی اقدار کی مخالفت مستقبل کے لئے کسی تعمیری لائحہ عمل کو مد نظر رکھے بغیر کی جا رہی ہے، موضوع تمدنی ہو یا سماجی، تاریخی ہو یا سیاسی، ملّی ہو یا مذہبی، دور جدید کی بے اطمینانی ہر مسئلے کا انجام فضولیت قرار دیتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں جنونیوں پر مشتمل ہوں گی۔ خیال کے خشک نٹے پن پر زبان کی چاشنیوں کو قربان کیا جا رہا ہے، صوبجاتی عصبیت اور جماعتی مقابلے جاری ہیں، بزرگ ادیبوں اور شاعروں میں سے اکثر ایسے ہیں جنہیں اپنے الجھے ذہنوں کی ڈھیلی ڈھالی گرفت کی قوت پر بھروسہ ہے اور نوجوان فنکاروں کے ذہنوں پر اپنے تجربے کو "حرف آخر" قرار دینے کی وحشت سوار ہے۔ اور سب پر مستزاد یہ کہ اکثر نقاد ــــ وہ خوب و زشت اور بلند و پست کا امتیاز کرنے اور خلوص اور غیر جانبداری سے اکتساب کرنے والے شاعر کے کلام کو فکری نقطۂ نظر سے جانچنے اور پرکھنے کے عادی ہی نہیں اور جو لوگ قدیم تنقیدی مفروضات کو بدل کر صحیح رہنمائی کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں ان پر ناتجربہ کاری اور "برخورداری" کا لیبل چپکا دیا جاتا ہے۔ کاش ان تمام اور ان کے علاوہ دیگر بے شمار خامیوں کو دور کرنے کے لئے ہمارے سب فن کار ــــ شاعر ہوں یا ادیب، رقاص ہوں یا نقاش، بت تراش ہوں یا موسیقی دان ــــ ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور پنجاب، اودھ، دکن اور بہار کی طفلانہ حد بندیوں سے بلند ہو کر اردو ادب اور مشرقی فنون کو ایک حقیقت ثابتہ بنا سکیں اور مغرب کو اپنے ایک ایک لفظ، ایک ایک حرکت اور ایک ایک تان کا متنظر رکھ سکیں!

(۸)

تیز احساس، حسین تعبیر، متوازن انتقاد ــــ یہ سچی شاعری کے تدریجی ادوار ہیں، اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ان

تین عناصر کے امتزاج سے میرا فن عبارت ہے، عین ممکن بلکہ اغلب ہے کہ پڑھنے والے کو میرے ہاں شدتِ احساس تو مل جائے لیکن تعمیر اور ارتقا کا ایک منضبط فلسفہ نظر نہ آئے، لیکن اگر اس کو میری ان منازل کی ہلکی سی جھلکی بھی دکھائی دے جائے، تو میں اپنی کوششوں کو ثمرور اور اپنے آپ کو خوش نصیب اور کامیاب خیال کروں گا۔ میرا ایمان ہے کہ اگر احساس بیدار ہو اور حیاتی بصارت ناقص نہ ہو تو دنیا کی تمام سیاسی اور سماجی برائیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ہم پر جتنے مصائب ٹوٹ چکے ہیں اور ماضی و حال میں انسانیت کو جن متعدد شب خونوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ان کی تحقیقی وجہ احساس کے فقدان کے سوا اور کوئی نہیں، اور اگر ہے تو اتنی نمایاں اور بنیادی نہیں اگر پڑھنے والے کے خیالات و احساسات میں میری نظمیں ایک نرم سی پھریری (میں جھنجوڑ کر جگانے کا قائل نہیں ہوں) پیدا کر سکیں تو میری محنتیں بار آور ثابت ہوں، ابھی میرے سفر کا آغاز ہے، مجھ میں کئی خامیاں ہوں گی، مجھ سے کئی لغزشیں سرزد ہوئی ہوں گی۔ کئی اصحاب میری نظموں کی ظاہری صورت سے مجھے تقلید کا مجرم قرار دیں گی۔ اکثر حضرات جلال و جمال میں آزاد نظمیں نہ پا کر میری کم حوصلگی کو کوسیں گے، ہر صحیح الخیال اور خوش مذاق انسان کو شاعر کے کلام پر رائے زنی کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ ایک سچے شاعر کی شاعری قوموں کی امانت ہے، مگر مجھے صرف اتنا کہنے کی اجازت دیجئے کہ میرے مقاصد گرے پڑے نہیں، میں ہر اچھی چیز سے استفادہ کا قائل ہوں۔ لیکن ریزہ چینی میرے مذہب میں گناہ ہے، مجھے یقین ہے (اور میرے اس دعوے میں کسی نوع کی خود پسندی کو دخل نہیں۔ کیونکہ اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کرنے اور اپنی خوبیوں کو مزید جلا دینے کا قائل ہوں) جلال و جمال میں آپ کو میرے مقاصد کے واضح خطوط جگہ جگہ نظر آ جائینگے اور اگر زندگی رہی تو میں ان خطوط کو واضح تر اور ان مقاصد کو روشن اور بلند تر کرنے میں کسی قسم کے تساہل سے کام نہ لوں گا۔ مجھے اپنے عزائم، اور ان کی وسعتوں اور امکانات کا مکمل احساس ہے، میں اب آپ کو اپنی صرف یہ دس سال کی نظمیں دے کر یہ نہیں کہوں گا کہ "مجھے رخصت دیجئے۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے، میرے پاس یہی کچھ تھا" ــــ اگر مجھے اپنی ہمتوں کی کوتاہی کا ذرا سا بھی خوف ہوتا تو میں جلال و جمال کی اشاعت ہی کو روک لیتا۔ کیونکہ اپنے بھائیوں کو اپنے ذہن کے بھنور میں پھنسا کر خود نہوں میں ڈوب جانا یا کسی خارجی امداد سے اُچک کر ساحل پر بیٹھ رہنا میرے نزدیک فن کار کی موت ہے اور فن کی توہین ہے۔

ماضی کی ادبی روایات سے یک قلم آزاد ہو جانا میرے لئے دشوار ہے، اس لئے نہیں کہ میں قدامت پرست ہوں۔ مجھے تو ماضی کے نام ہی سے گھن آتی ہے۔ ماضی کا سہارا لیکر مستقبل کی راہ دکھانے والوں، بڑھتی اور لپکتی ہوئی انسانیت، کو پھر سے قبروں اور مرگھٹوں کو لوٹا لانے والوں کی نیتوں پر مجھے ہمیشہ شک رہا ہے، لیکن کئی ایسے مسائل بھی تو ہیں جو ازل سے لے کر ابد تک نہیں بدلتے، جن کی حالت ظاہراً متغیر ہونے کے باوجود غیر متغیر ہے ایسے مسائل اگر ماضی میں ہمارے زمانے کے مقابلہ میں زیادہ خوبی سے پنپ سکے تو ان کا ذکر کوئی جرم نہیں بلکہ مستحسن ہے، ــــ اسی لئے ماضی کی ادبی روایات کی کئی خصوصیات مجھے عزیز ہیں، بالکل اس طرح جیسے نئے ادب کے اکثر پہلوؤں سے مجھے شغف اور محبت ہے، پرانی شاعری کی جس خوبی نے مجھے آج تک مسحور رکھا ہے۔ وہ ان

قدیم اشعار کا "روحانی نغمہ" ہے (اشعار کے ساتھ قدیم کا لفظ لکھ کر میں چونکا ہوں، اور مجھے کسی نقاد کا یہ قول یاد آگیا ہے کہ ادبیات میں وقت کا وجود ہے ہی نہیں ـــــ اور اگر ہے تو وہ مرتا ہی نہیں، مر ہی نہیں سکتا، مطلب کی وضاحت کے لئے مجبوراً اصطلاحات کا سہارا لینا پڑتا ہے ع بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر) اُردو کے کسی مرحوم نقاد نے شاعری میں اس غیر محسوس نغمگی کو "روحانی نغمہ" کا نام دیا تھا مجھے بھی اسی بے نام تاثیر احساسات کی گہرائیوں میں سرایت کر جانے والی اس نامعلوم سی لہر کے لئے کوئی دوسرا نام نہیں سوجھا، میر، مومن، غالب اور اقبال کے اکثر و بیشتر اشعار میں جو "نشتریت" ہے، وہ اس "روحانی نغمہ" کی مرہونِ منت ہے، اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کے بغیر کسی زبان کی شاعری پائدار حیثیت نہیں اختیار کر سکتی۔ یہ خدا کی دین ہے، شعوری طور پر اکتساب کا نتیجہ نہیں، یہ نغمہ اخلاقی و ذہنی جمال کو نکھارتا ہے، اور بلند شاعری کو تک بندی سے ممیز کرتا ہے، یہ حلاوت اور نزاکت ہماری نئی شاعری کے بیشتر حصے میں مفقود ہے، اور ذاتی طور پر مجھے اس کا دکھ ہے، اس لئے کہ جو شاعری "روحانی نغمہ" سے خالی ہے، وہ بہت جلد مٹ جانے والی ہے، آنے والی نسلیں اس شاعری کے مجموعوں کو تاریخی نوادرات سمجھ کر عجائب گھروں اور لائبریریوں کی سالخوردہ الماریوں میں اچٹتی نظروں سے دیکھنے پر ہی اکتفا کریں گی، اور ان کے خالقوں کے نام تذکرہ نویسوں کے کھلونے بن کر رہ جائیں گے۔

لیکن نئی شاعری کی کئی خصوصیات ایسی بھی ہیں، جن کو اپنائے بغیر ہم فنی خلوص کا دعویٰ ہی نہیں کر سکتے، یہ دور ہر مسئلے کو بین الملی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے، آخر یہ کیا بات ہے، کہ ہندوستان میں پٹرول کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ تو برطانوی سیاستدانوں کے احکام کے مطابق ہندوستانی فوجیں ایران میں تیل کے چشموں کی دیکھ بھال کے لئے ساحل ایران پر جا اترتی ہیں، اور ایران چونکتا ہے، روس شمالی ایران کی سرحد پر اپنی فوجیں جمع کرنے لگتا ہے، برطانیہ کی پارلیمان میں مباحثے شروع ہو جاتے ہیں، پیرس کی امن کانفرنس میں ایک مذبذب سا سکوت چھا جاتا ہے، امریکہ ہزاروں میل دور سے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے تڑپ اٹھتا ہے، افغانستان، ترکی اور مصر منتظرانہ اپنے اپنے دریچوں میں سے جھانکتے ہیں، اور انسانیت دم بخود ہو کر ایران کے جنوب میں تیل کے چشموں پر نظریں جمائے تاریخ کے ایک نئے ورق کے الٹے جانے کی کھڑکھڑاہٹ سننے کو ہمہ تن گوش ہو جاتی ہے، ہزاروں مثالوں میں سے یہ ایک ننھی سی مثال ہے جس سے صاف ظاہر ہے، کہ ہم کسی سیاسی، سماجی یا اقتصادی مسئلہ کو اپنی ملکی حدود میں بند نہیں رکھ سکتے، جو فن کار دنیا کی نت نئی اہم سیاسی تحریکوں سے بے خبر ہے، نئے اقتصادی مسائل کے اسباب و علل اور تاریخی واقعات کے اثرات اور ردعمل سے بے بہرہ ہے، اسے خاموشی اختیار کر کے ادب کی جدید مقتضیات پر رحم کرنا چاہیئے۔ اس دور میں زندگی کی جدلیات کا عرفان اور تاریخی شعور فن کار کے لئے ازبس ضروری ہیں، انسانی زندگی پر سیاسیات کے اثرات اس درجہ بے پناہ ہیں، کہ ان سے اغماض برتنا زندگی کی قوت و حرکت سے انکار کرنا ہے، سچا شاعر خلا میں شاعری نہیں کرتا، جبلت اور احساس کی فطری بالیدگی کے علاوہ گردوپیش کی زندگی کے حقائق اسے پیدا کرتے ہیں، اس کی شخصیت معاصرانہ ماحول کی پیداوار ہے، اور شاعری اگر شاعر کی

شخصیت کا اظہار ہے، تو اپنے ماحول سے بیگانگی کیسے برت سکتا ہے،

لیکن شخصیت کا اظہار ایک ایسی انفرادیت کا متقاضی نہیں، جو انسان کو ایک بیراگی کی طرح اپنی الگ تھلگ دنیا بسانے پر مجبور کر دے، انفرادیت ایک خاص اسلوب، ایک نرالے طرزِ اظہار، اور ایک نئے مگر جانے بوجھے قسم کے مواد کا مرکب ہوتی ہے، اور یہ تب ہی کامیاب ہو سکتی ہے جب شاعر کا تخیلہ اپنی انفرادیت کی قوت سے کائنات گیر وسعت اختیار کرلے، اور فرد اور جماعت میں کوئی حدِ امتیاز باقی نہ چھوڑے میں مسلمان ہوں، میری تہذیب و ثقافت عالم گیر ہے، اور میرا بنیادی عقیدہ خالق کی وحدت اور انسانیت کی مساوات ہے میرا مذہب کبھی میری انفرادیت کی ترقی اور میری شخصیت کے اظہار میں مزاحم نہیں ہوا! اس لئے عالمگیر مسائل پر آزادانہ رائے زنی کرنے میں مجھے کبھی کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوئی، یہ میں اپنی ذات کی بات کر رہا ہوں، عین ممکن ہے، کہ دوسرے مذاہب بھی اپنے حلقہ بگوشوں کو اس نوع کی آزادی دینے اور عالم گیر شخصیت کی تعمیر میں ممد ثابت ہوسکیں، کیونکہ آخر تمام بڑے بڑے مذاہب کے داعیوں کا مقصد تو انسانیت کی عظمت اور انسانی خیالات کی پاکیزگی و طہارت ہی تھا،

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ماحول کی ہو بہو عکاسی اپنی جگہ پر اہم ہوتے ہوئے بھی ادب اور زندگی کے اصولِ ارتقاء کے منافی ہے، علامہ شبلی رح، شعر العجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

> ایک پھول کو دیکھ کر سائنس دان تحقیق کرنا چاہتا ہے، کہ وہ نباتات کے کس خاندان سے ہے، اس کے رنگ میں کن رنگوں کی آمیزش ہے، اس کی غذا زمین کے کن اجزا سے ہے، اس میں نر و مادہ دونوں کے اجزا ہیں، یا ایک کے، لیکن شاعر کو ان چیزوں سے غرض نہیں، پھول کو دیکھ کر بے اختیار اس کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ ع
>
> اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری!

اور اگر ہم پھول کو ایک سائنس دان کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہیں، اور اسی کو ماحول کی عکاسی کہتے ہیں، تو چار طرف پھیلے ہوئے کہرے کو اڑانے، آگے بڑھنے، نئی راہیں ڈھونڈنے اور ترا شنے نیز منزل کو معین کرنے کی مسلسل کوشش کے لئے کون باقی رہ جاتا ہے! حقیقت کی ہولناک صورتوں کو نظانے والے دوستوں سے بھی مجھے یہی کہنا ہے کہ مجھے حقیقت کی عظمت سے انکار نہیں، لیکن میں صوری پہلو سے بے پروائی کو کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا، شاعری حقیقت کا سنگار ہے، اور جن لوگوں کے نزدیک حقیقت کو سنگار کی ضرورت ہی نہیں، ان کے اظہارِ خیال کے لئے نثر موجود ہے!

صرف آس پاس کے بکھرے ہوئے حقائق کو پیش کر کے ادبی فرائض سے غافل ہو بیٹھنا کوتاہ اندیشی ہے، ہر ذرّے کے پرے ایک اور ذرہ موجود ہے، صرف ایک ذرّے کو کائنات کا مرقع قرار دے دینا ادبی جمود ہے، ہم نئے شاعروں کو اپنے ہر جذبہ، ہر عزم اور ہر ولولہ میں حرکت و عمل کی قوتوں کو سمو لینا چاہیئے، لیکن کچھ اس طرح کہ ہماری

یہ کوششیں شعوری نہ رہیں، بلکہ وجدانی حیثیت اختیار کر جائیں، اس کے لئے انتہا درجہ کی مشق یعنی فنی ریاضت کی ضرورت ہے، تعمیر و ارتقار میں تقاضائے فطرت ہے، تہذیب و تمدن اسی تعمیری اور ارتقائی عمل کے نتائج ہیں، شاعر اگر فلسفۂ ارتقار پر صرف محدود نظری عبور رکھتا ہو، تو وہ دہرائی ہوئی باتوں کو دہراتا چلا جائے گا، اور ارتقار کی رفتار کو بڑھانے میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لے سکیگا، ہر سچے فن کار کو اس بنیادی فلسفہ پر عبور حاصل ہونا چاہیئے، اور یہ تبھی ممکن ہے، جب ہم زندگی کی جدلیات سے بے بہرہ نہ ہوں، اپنے مفروضوں کو پتھر پر لکیر نہ سمجھیں، اعتراضات پر غور کریں، اور ان مفروضوں اور اعتراضات کی روشنی میں ایک ایسی راہ تلاش کریں جس میں ہمیں انسانیت کا ذہنی تعاون حاصل ہو، یہاں فلسفۂ ارتقا کی تفصیل میں جانا بے معنی ہے، مگر اپنے مقصد کی وضاحت کے لئے مجھے صرف اتنا کہنا ہے، کہ انسانی ذہن سے درندگی کو خارج کرنا، اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو اسے کم کرنا، انسانی شائستگی کو ابھارنا اور فن کو نسخۂ شفا بنانا ہی ارتقا ہے

لیکن فن کی یہ طہارت اور پاکیزگی شاعری کی کسی ایک صنف تک محدود نہیں، اگر ہمارے ذوق و وجدان کی سلامتی بے داغ نہیں، تو ہم شعر میں وہ دلآویزی، وہ ساحرانہ اثر آفرینی وہ مخفی جذب و کشش نہیں پیدا کر سکیں گے جو شائستہ اور مہذب شاعری کے نمایاں عناصر ہیں، سلامتئ ذوق، خلوص بیان، حرکت و حیات، جوش و خروش شاعرانہ حسن و صداقت کا احساس، احترام انسانیت، شخصی دکھ کو انسانی دکھ بنا لینے کا کمال، متانت اور شائستگی سنجیدگی اور پختگی، عالمگیر کیفیت، حلاوت و نزاکت، لوچ اور نغمہ، فکر اور لباس کی ہم آہنگی، نئی توانائیوں کا وسیع عرفان، یہ اور اسی نوع کی دیگر خصوصیات خلاق شاعری کے غیر متبدل عناصر ہیں، اگر یہ ماضی کی شاعری میں موجود ہیں، تو ماضی کی ادبی روایات سے بغاوت بے معنی ہے، اگر یہ حال کی شاعری میں رچے ہوئے ہیں۔ تو جدید شعرا کی مخالفت محض بچپنا ہے، ان عناصر کے حصول کے لئے ماضی سے بیزاری ضروری نہیں اور نہ محض فن کی وجدانی کیفیت ہی کافی ہے، مشاہدہ و مطالعہ کی بے پناہ وسعتوں پر بھی حاوی ہونا ضروری ہے اور اس ضمن میں مشرقی علم و ادب کا مطالعہ ازبس اہم ہے، شاعری بچوں کا کھیل نہیں مشہور انگریزی نقاد ایبر کرومبی کے الفاظ ہیں :-

"فن شاعری سے زیادہ کسی چیز میں بھی اس درجہ
متحملانہ خصوصی مہارت کی ضرورت نہیں پڑتی !"

میں نے اوپر جن غیر متغیر عناصر کی فہرست گنائی ہے، وہ ظاہری صورت میں کڑی پابندیوں کا پلندہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اصلاً یہ تمام صفات سلامتئ ذوق سے تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ مشاہدہ و مطالعہ سے بھی تو وہی انسان بھرپور فائدہ اٹھا سکے گا، جس کا وجدان منزہ اور حساس ہے، اور جو استفادہ اور تقلید میں فرق محسوس کر سکتا ہے،

سلامتئ ذوق ہی ہم سے لہجے کی نرمی کی متقاضی ہے، انقلابی شاعری بھی اگر نرم اور لوچدار انداز میں کی جائے

تو اس کا اثر گرجنے، برسنے والے الفاظ سے زیادہ ہوگا، لہجے کی نرمی سے یہاں اداسی، بے عملی اور عجز کا مطلب نہ اخذ کیا جائے سختی ونرمی کا صحیح امتزاج ہی صحیح زندگی ہے، لیکن اس صورت میں کہ نرمی نمایاں رہے، حسرت ومحرومی کی شاعری مردود سہی، لیکن انسانی زندگی میں المیہ کی اہمیت بدستور قائم ہے، حسرت ومحرومی ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے پر دلالت کرتی ہے، جبکہ شاعری کا المیہ عنصر حالاتِ موجودہ کے خلاف بغاوت اور سرکشی پر ابھارتا ہے، اس مقام پر اندازِ بیان کی انفرادیت یہ حدِ امتیاز قائم کرنے کی ذمہ دار ہے،

میں کسی ملک کی شاعری کی کسی بھی مروجہ صنف کو جمالیاتی زاویۂ نگاہ سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا، اور میرا جمالیاتی احساس توپ کی گرج کو نہایت وسیع القلبی سے قبول کر سکتا ہے بشرطیکہ اس گرج کے آخری نقطے پر ہی سہی، مجھے جھانجھن کی جھنکار بھی سنائی دے جائے، میں ہر تخریب میں تعمیر کا جویا ہوں، ہر الم کو عمل کا محرک بنانا چاہتا ہوں، میں ولولۂ حیات کا شاعر ہوں، زندگی میری محبوبہ ہے، میں اولادِ آدم کو اتنا بے بس نہیں سمجھتا، کہ موجودہ دَور کی حشر سامانیوں کے بعد وہ سیاسی، سماجی اور اخلاقی کھنڈروں کے ملبے میں سے ابھر ہی نہ سکے، میں افق کو تک رہا ہوں، کیونکہ مجھے نئے کاروانوں کے سفر جاری کرنے بلکہ کئی مسافتیں طے کر آنے کا احساس ہو چکا ہے، میں اپنے آپ اور اپنے تمام محترم ومحبوب معاصرین میں ایک زبردست فکری ہمہ گیری، عمق اور بلندی دیکھنا چاہتا ہوں، میرا یقین ہے، کہ نظامِ فکر کا انقلاب نظامِ حیات کو منقلب کرنے کا واحد ذریعہ ہے، لیکن میں اپنے فکری جوش وخروش میں فنی مطالبات کو مجروح کرنے کا قائل نہیں ہوں، کیونکہ اس فن کا نام شاعری صرف اس لئے ہے، کہ یہ دربارِ جمالیات کی صدرِ اعظم ہے!

(۹)

فن کی تکمیل کا دعویٰ ایک مجنونانہ فعل ہے، فنِ شعر کے متعلق میرے اظہارِ خیال کو اپنی ہی شاعری پر تبصرہ نہ سمجھا جائے، یہ سب کچھ میرے فنی عزائم کی منزل کا خاکا ہے، اور میں ابھی راستے کے آغاز میں ہوں، مقصد صرف یہ تھا کہ اردو شاعری کے متعلق اپنے نظریات کو پیش کر دوں، تاکہ میرے حالات کے علاوہ میرے خیالات بھی میری نظموں، غزلوں اور قطعوں کے تخلیقی پس منظر کا کام دے سکیں، عین ممکن ہے، کہ آگے چل کر جب میرے مشاہدہ ومطالعہ میں مزید وسعت پیدا ہو، تو ان نظریات میں سے اکثر کی صورت بدل جائے، یہ یقین کی خامی یا عدمِ خود اعتمادی نہیں، تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی کا تقاضا ہے،

جلال وجمال کو میں نے چھ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، ہر حصے کی نظمیں تاریخی لحاظ سے ترتیب دی ہیں، اور ہر حصہ ایک الگ موضوع سے متعلق ہے، ان نظموں اور غزلوں کا انتخاب میرا اپنا ہے، البتہ ان پر نظرِ ثانی کرنے اور زبان وبیان کی چند لغزشوں کی طرف مشفقانہ اشارے کرنے کے لئے میں مخدومی حضرت مولانا عبدالمجید صاحب سالک کا سپاس گذار ہوں، علاوہ ازیں برادرِ مکرم حضرت اختر شیرانی صاحب میرے قلبی شکریے کے مستحق ہیں، جنہوں نے میری شاعری کے ابتدائی سالوں میں مجھے فن کی جمالیاتی اقدار کے نہایت مفید اور زریں راز

بتائے، برادرِ گرامی پیرزادہ محمد بخش صاحب قاسمی نے مسودے کی تیاری میں میری بے بہا امداد فرمائی، کاپیاں اور پروف دیکھنے میں بھائی سرور نیازی صاحب نے میرا ہاتھ بٹایا، کتاب کی صوری خوبیاں چودھری نذیر احمد صاحب مالک نیا ادارہ کے مذاقِ لطیف کی منت کش ہیں، میں ان تمام حضرات کا ممنون ہوں،

اس مجموعے کا نظر افروز گرد پوش مخدومی حضرت عبدالرحمٰن صاحب چغتائی نے تیار فرمایا ہے۔ ان خطوط میں انہوں نے بے پناہ جلال و جمال سے جلال و جمال کے نقوش کو ابھارا ہے، اور میں ان کا شکر گذار ہوں، کہ انہوں نے اس مجموعے کے جسم کو اس کی روح سے بڑی چابک دستی سے ہم آہنگ کر دیا ہے،

۱۳- ستمبر ۱۹۴۶ء
انگہ۔ ضلع سرگودہا (پنجاب)

ندیم

شعر کا دیوتا

تصور کی چپ چاپ خلوت میں اکثر کوئی شوخ یوں گنگناتا ہے شب بھر
کہ جیسے تھرکتا ہے شفّاف جھرنا حسیں سنگریزوں کو ہمراہ لے کر
یہ اَن دیکھا محبوب، جانے، مجھے کیسی پگڈنڈیوں پر لئے جا رہا ہے
مجھے ہر قدم پر اچھوتے خیالات کا اک دفینہ دئے جا رہا ہے
ستارے مرے پاؤں میں لوٹتے ہیں، تو پھولوں کی بارش سی ہوتی ہے سر پر
کبھی عرش کی وسعتوں پر قدم ہے، کبھی پھیل جاتے ہیں پردے نظر پر
کبھی دل کی دھڑکن میں موہوم سایوں کی جھانجھن، چھناکے سے کرتی ہے پیدا
کبھی ان چھناکوں کی افسوں طرازی رگوں میں دھماکے سے کرتی ہے پیدا
کبھی زلف و رُخ کی حکایت میں غلطاں، کبھی امتوں کے مقدر پہ لرزاں
سرور و طرب میں بھی رہتا ہوں گریاں، وفورِ الم میں بھی ہوتا ہوں خنداں
کبھی نرم کرنوں میں شبنم کے موتی پروتے ہوئے مسکراتی ہیں آنکھیں
افق پر کبھی دیکھ کر زرد تاروں کو بجھتے ہوئے، ڈبڈباتی ہیں آنکھیں

جلال و جمال

کبھی زندگی کو حقیقت سمجھ کر الجھتا ہوں قانون کی رفعتوں سے

کبھی دیکھتا ہوں حقیقت کا دامن لپٹتا ہوا وقت کی گردشوں سے

کبھی ایک ذرّے میں لاکھوں زمینیں، کبھی ایک پل میں کروڑوں زمانے

میں کیا ہوں، کہاں کا ارادہ ہے میرا، مجھے کون سمجھے، مجھے کون جانے

الٰہی! خیالوں کے خلوت کدے میں کوئی شعبدہ باز سا آ بسا ہے

وہ پردے ہٹے۔ وہ کوئی مسکرایا ــــ مجھے ہو بہو تو نظر آ رہا ہے

۱۹۴۱ء

(۱)

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

غالب

ناتمام

کہکشاں پر جب تصوّر کے سفینے ہوں رواں
جب مرے افکار کے سائے میں ہوں کون و مکاں
آسمانوں سے گذر جائے مرا پیک خیال
پھیل جائیں خلدزاروں پر مرے خوابوں کے جال
جب ہر اک شے میں نظر آئے مجھے اپنا وجود
میری مدہوشی میں کھو جائے فشارِ ہست و بود
جب مہ و خورشید و انجم پر ہوں میں چھایا ہوا
یعنی جب ہو رُوح کو اک وجد سا آیا ہوا
اک خلا محسوس کرتا ہوں میں اپنے دل کے پاس
باوجود اتنی بلندی کے بھی رہتا ہوں اداس

۱۹۳۷ء

مردِ خود شناس

مٹا مٹا کے بنایا جسے زمانے نے
کتابِ عشق کا وہ حرفِ دلپذیر ہوں میں

نہیں کسی کی بھی محتاج میری طبعِ غیور
نشانہ جس کے تجسّس میں ہے وہ تیر ہوں میں

تڑپ تڑپ کے چمکنے کے راز مجھ سے پوچھ
کہ آسماں کے ستاروں کا ہمصفیر ہوں میں

مرے خیال کی جولانیاں ہیں لامحدود
اگرچہ کشمکشِ دہر میں اسیر ہوں میں

کلی چٹک کے سناتی ہے مجھ کو سازِ حیات
گدازِ روح کی خود آپ ہی نظیر ہوں میں

برے بھلے کی مجھے خود خبر ہے میرے بزرگ
کہ اپنے کاتبِ اعمال کا مشیر ہوں میں

یہی ثبوت ہے میری فلک نشینی کا
نگاہِ اہلِ خرد میں اگر حقیر ہوں میں

تباہیوں سے خود آگاہیاں نچوڑی ہیں
کلائیاں غمِ ایام کی مروڑی ہیں

۱۹۳۸ء

بارگاہِ نیاز

جھکتے ہیں سرکشوں کے شب و روز سر یہاں
رہتا ہے نورِ حسنِ ازل جلوہ گر یہاں

ہے امتیازِ مرگ و حیات ایک دل لگی
پاتا نہیں ہوں اپنے نفس کی خبر یہاں

ہوتی ہیں دو جہاں پہ نگاہیں مری محیط
ملتی ہے جب کسی کی نظر سے نظر یہاں

بیگانگی کے جن کی زباں پر رہے گلے
پاتے ہیں حسن و عشق کو شیر و شکر یہاں

جن کے قدم جرس کی صدا پر نہ اٹھ سکے
کرتے ہیں پل میں کون و مکاں کا سفر یہاں

مذہب بھی اپنے حال پہ رہتا ہے اشکبار
منطق بھی ڈال دیتی ہے اپنی سپر یہاں

جس کی تلاش کرتے رہے لوگ عرش پر
دل سے نکل کے ہنستا ہے وہ سیم بر یہاں

ایک ایک پل ہے زندگیِ جاوداں ندیم
پاتا ہوں عمرِ خضر کو بھی مختصر یہاں

۱۹۳۹ء

طلب

دھندلکوں میں سمایا جا رہا ہوں
خدا جانے کسے یاد آ رہا ہوں

خرد پر ظلمتوں کے جال بُن کر
دلِ تاریک کو چمکا رہا ہوں

جنوں کا منتہیٰ تیری رضا ہے
تغافل پہ ترے اترا رہا ہوں

طلب کے پیچ کھاتے راستوں پر
گرجتا، دندناتا جا رہا ہوں

بیابانوں کی مردہ وسعتوں میں
نشانِ زندگی لہرا رہا ہوں

ارادوں کی نئی شمعیں جلا کر
ستاروں کو بجھاتا جا رہا ہوں

مجھے رازوں کے موتی رولنے ہیں
یمِ عالم میں غوطے کھا رہا ہوں

حوادث کے تھپیڑوں سے الجھ کر
سنورتا اور نکھرتا آ رہا ہوں

یہ مجھ پر نزع کا عالم نہیں ہے
کوئی کھوئی ہوئی شے پا رہا ہوں

۱۹۴۰ء

اُمید کی کرن

ہوگئی عیش گاہ جب سنسان، نظر آنے لگا جہاں حیران
سیج پر گل پڑے تھے مسلے ہوئے جیسے ہونٹوں پہ خون کے قطرے
فرش پر ڈھیر تھا پتنگوں کا دھبّا اک ملگجے سے رنگوں کا
زردیوں پڑ رہی تھی شمع کی لو حسن پر جیسے موت کا پرتو
اونچے محراب، سرد اور خموش جیسے اک زاہدِ کفن بردوش

شمع جب ہولے ہولے بجھنے لگی
میرے احساس نے پھریری لی

کل اسی عیش گاہ کے اندر نظر آئے گا پھر وہی منظر
رقص ہوں گے سرود کی دھن پر عشق سونگھے گا پھول چن چن کر
لوگ بے فکر گیت گائیں گے موت پر پھبتیاں اڑائیں گے
باہیں باہوں میں پھنس کے جھومیں گی نظریں نظروں کے تیر چومیں گی
بکھرے گی بازوؤں پہ زلفِ دراز جھوٹے پندار کے کھلیں گے راز

ریشمی پردے سرسرائیں گے
لوگ تھک تھک کے اٹھتے جائیں گے

جلال و جمال

اختلافات ہیں جہاں کی اساس اس کو یکرنگیاں نہیں ہیں راس

رات جس دم جماہی لیتی ہے دن کی آہٹ سنائی دیتی ہے

ٹوٹتا ہے جونہی کوئی ڈنٹھل پھوٹ پڑتی ہے اک نئی کونپل

میں نے تن من کسی پہ وار دیا دل سے بارِ خودی اتار دیا

کھو کے سب کچھ اسے بھی کھو بیٹھا یعنی وہ دوسروں کا ہو بیٹھا

لیکن احساس مجھ سے کہتا ہے

جھرنا رستہ بدلتا رہتا ہے

۱۹۴۰ء

گناہِ بے گناہی

ہوس سے عشق کو دست و گریباں کر دیا میں نے
زمانے کے خرد مندوں کو حیراں کر دیا میں نے

لہو ٹپکا کے گرد آلود اور آوارہ تنکوں پر
زمیں کے چپے چپے کو گلستاں کر دیا میں نے

قدمبوسی ہی جن بدبخت ذرّوں کا مقدّر تھی
جلا دے کر انہیں مہرِ درخشاں کر دیا میں نے

غریبوں کے گریباں کو قباؤں میں بدل ڈالا
امیروں کی قباؤں کو گریباں کر دیا میں نے

جلا کر شمعِ احساس و تفکر خانۂ دل میں
اندھیرے رہگزاروں پہ چراغاں کر دیا میں نے

جسے تہذیبِ حاضر نے نکالا اپنی محفل سے
پھر اس جوشِ جنوں کو دین و ایماں کر دیا میں نے

غرض احساس کی قندیل کو سینے میں بھڑکا کر
پھر اس بھٹکے ہوئے انساں کو انساں کر دیا میں نے

مگر باایں ہمہ اسلاف کی تاریخ کہتی ہے
کہ اپنی خانماں سوزی کا ساماں کر دیا میں نے

۱۹۴۰ء

ازلی مسرّتوں کی ازلی منزل

ٹیالے ٹیالے بادل گھوم رہے ہیں میدانوں کے پھیلاؤ پر
دریا کی دیوانی لہریں ہمک ہمک کر ہنس دیتی ہیں اک ناؤ پر

سامنے عنابی پربت کی ابر آلود بلندی پر ہے ایک شوالا
جس کے کلس کی تابانی سے پھیل رہا ہے ہر سو ایک عجیب اجالا

ٹم ٹم کرتی اک مشعل سے محرابوں کے گہرے سائے رقصیدہ ہیں
ہر سو پریاں ناچ رہی ہیں جن کے عارض رخشاں، نظریں دزدیدہ ہیں

عنبر اور لوبان کی لہریں دوشیزہ کی زلفوں کے سے بل کھاتی ہیں
چاندی کے ناقوس کی تانیں دھندلے دھندلے نظاروں میں گھل جاتی ہیں

ہاتھ بڑھائے سر نیہوڑائے پتلے سایوں کا اک جھرمٹ جھوم رہا ہے
پوجا میں بے خود سا ہو کر مندر کے تابندہ زینے چوم رہا ہے

ایک بہت تپلی پگڈنڈی ساحل دریا سے مندر تک کانپ رہی ہے
ناؤ چلانے والی لڑکی چپّو کو ماتھے سے لگائے ہانپ رہی ہے

دیوانی کو کون بتائے اس مندر کی دھن میں سب تھک ہار گئے ہیں
سائے بن کر گھوم رہے ہیں جو بیباک چلانے والے ہار گئے ہیں

جلال و جمال

وہ جب ناؤ سے اترے گی ٹمیالے ٹمیالے بادل گھر آئیں گے

میدانوں پر، کہساروں پر، دریا پر، ناؤ پر، سب پر چھا جائیں گے

اوّل تو پگڈنڈی کھو کر گر جائے گی کالے غاروں میں بے چاری

بچ نکلی تو ہو جائے گی اس کے نازک دل پر اک ہیبت سی طاری

ہوش میں آئی تو رگ رگ پر ایک نشہ سا بیہوشی کا چھایا ہوگا

جسم کے بدلے اس مندر میں ایک لجیلا اک لچکیلا سایا ہوگا

۱۹۴۰ء

دل کا مرثیہ

(ایک بے پناہ ذہنی شکست سے متاثر ہو کر)

وہ دل، وہ بحرِ غم کا شناور کدھر گیا
وہ کاروانِ شوق کا رہبر کدھر گیا

وا کر کے مجھ پہ رازِ حیاتِ گسستہ پا
میرا رسول، میرا پیمبر کدھر گیا

تاریکیاں ہیں وسعتِ عالم پہ خیمہ زن
وہ ماہ و آفتاب کا ہمسر کدھر گیا

افسردہ ہے خیال تو جذبات مردہ ہیں
احساس کی جبیں کا وہ جھومر کدھر گیا

بخشا تھا جس نے سوزِ براہیم رُوح کو
بُت خانۂ جنوں کا وہ آذر کدھر گیا

میں جس کی وسعتوں میں بھٹکتا پھرا کبھی
وہ دشت کیا ہوا، وہ سمندر کدھر گیا

جس کی نوا سے کون و مکاں تک بہک گئے
وہ انگبیں فروش سخنور کدھر گیا

اوہام کی سپاہ نے سجدے کئے جسے
وہ صف شکن یقین کا خنجر کدھر گیا

کس آس پر اٹھائے پھروں جامِ زندگی
اس جام سے وہ بادۂ احمر کدھر گیا

سُونا پڑا ہوا ہے جہانِ طلب ندیمؔ
وہ خضر کیا ہوا، وہ سکندر کدھر گیا

۱۹۴۰ء

عزم

اڑ گئی روح کے آئینے سے گردِ تقلید
ناخدا اب میری کشتی کا کوئی غیر نہیں
ذرّے ذرّے میں نظر آتا ہے معبد مجھ کو
میرے ایماں کو جنونِ حرم و دیر نہیں

رخشِ احساس کی ہے باگ مرے ہاتھوں میں
اب کوئی میرے خیالوں کو نہیں بھٹکاتا
نام دیتی ہے غلامی کا جسے یہ دنیا
میرے جذبات پہ وہ بھوت نہیں منڈلاتا

کائنات ایک کھلونا ہے مری نظروں میں
جی میں جس طرح بھی آئے گی گھماؤں گا اسے
اس میں گوندھے ہوئے جوہر کو پرکھنے کے لئے
گاہ توڑوں گا اسے گاہ بناؤں گا اسے

جلال و جمال

میری قسمت کو نچائے گا ارادہ میرا
میرے پنجے میں سمٹ آئیں گی سب تقدیریں
گل کے بن جائیں گی حریتِ عالم کا حصار
بازوئے دہر سے لپٹی ہوئی یہ زنجیریں

منجمد قلب سے لپکیں گے بھڑکتے شعلے
اور جل جائے گا ادراک کا فرسودہ نظام
خاک بوسوں کو اچھالوں گا فلک کی جانب
محو کر دے گا ستاروں کو بھی انساں کا مقام

۱۹۴۱ء

مردِ آزاد

پھر سازِ دل کو نغمہ سرا کر رہا ہوں میں
پھر زندگی کی نشو و نما کر رہا ہوں میں

احساس کی نگاہ میں جو عین ذات ہیں
ان کافروں کی مدح و ثنا کر رہا ہوں میں

اب سیر ہو چکا ہوں سکونِ حیات سے
جو کچھ عطا ہوا ہے فنا کر رہا ہوں میں

بے سوز دل، بلند نگاہی کی موت ہے
اپنی تباہیوں کی دعا کر رہا ہوں میں

اخلاق مضطرب ہے تو مذہب ہے بیقرار
احساس مطمئن ہے خطا کر رہا ہوں میں

سر پوچھتا ہے "جان کے کیوں مر رہا ہے تو؟"
دل کہہ رہا ہے "فرض ادا کر رہا ہوں میں"

جاؤ کوئی بتاؤ فقیہانِ شہر کو
جو کچھ بھی کر رہا ہوں بجا کر رہا ہوں میں

۱۹۴۱ء

عرفاں

(مسافر)

مہیب رات ہے، تاریکیاں ہیں چھائی ہوئی
تجلیات کو ہے آج نیند آئی ہوئی

فضائے تیرہ میں جب بجلیاں کڑکتی ہیں،
قریب و دُور سے پرچھائیاں لپکتی ہیں

مرے جگر کو مسلسل مسل رہا ہے کوئی
مرے خیال کے صحرا میں چل رہا ہے کوئی

گھناؤنی ہے، پُراسرار ہے فضا ساری
تصوّرات پہ اک کپکپی سی ہے طاری

میں اک غریب مسافر ہوں، کوئی راہ دکھائے
مجھے قریب کی آبادیوں میں پہنچا آئے

(آواز)

یہ امتحاں ہے ترا، ہر قدم سنبھل کے اُٹھا
شروعِ عشق کی ان الجھنوں میں ڈوب نہ جا

یہ ابتدا ہے، ابھی سے نہ انتہا کو بلا
کنارا چھوڑ کے فوراً نہ ناخدا کو بُلا

ترے خیال کی منزل ابھی قریب نہیں
تو تہمات میں پنہاں ترا حبیب نہیں،

دل و دماغ کی واماندگی ہے خوف و ہراس
نہیں جنوں کے نہنگوں کو احتیاجِ لباس

اگر یہ مرحلہ سخت تیرے بس کا نہیں
ندیم! دلولۂ شوق ایک خس کا نہیں

(مسافر)

الم نصیب مسافر سے اجتناب نہ کر
مجھے خدا کے لئے وقفِ احتساب نہ کر

نہ چھیڑ ولولۂ شوق کی کہانی کو،
نہ دے ہوائیں مری ملتہب جوانی کو

لگا نہ ٹھیس تمنائے باریابی کو
پلا نہ زہر کے جرعات اس شرابی کو

اگر یہ پہنچ نہ سکا میں حریم جاناں میں
بگولا بن کے بھٹک جاؤں گا بیاباں میں

مگر یہ نیرگیاں راستے میں حائل ہیں
یہاں شعور کے کتنے الگ مسائل ہیں

(آواز)

نہیں ہے پختہ ابھی خواہشِ وصال تری
جھجک رہی ہے نگاہِ بلند بال تری

اندھیری راہوں میں سر نوچتا پھرے گا تو
خود اپنے وہم کے گرداب میں گھرے گا تو

ترے افق پہ ستارہ نہ کوئی چمکے گا
کوئی چراغ نہ ان ظلمتوں میں دمکے گا

اسی تلاش میں کٹ جائے گی حیات تری
انہیں خطوط پہ گھومے گی کائنات تری

تجھے جہان میں جب کچھ نظر نہ آئے گا
ترا حبیب ترے دل میں مسکرائے گا

۱۹۴۱ء

بے قراریاں

دل میں جب بے کلی نہیں رہتی زندگی زندگی نہیں رہتی
زندگی شاہراہِ پُرخم ہے زندگی اضطرابِ پیہم ہے
رعشۂ برق ہے حیات اپنی
بے مقامی ہے کائنات اپنی

کتنی خاموش ہے فضائے جہاں نیند میں کھو گئے ہیں کون و مکاں
نیم کی پتلی ڈالیاں خاموش گاؤں کی گانے والیاں خاموش
سونی گلیاں اجاڑ سی چوپال
زندگی کی جبیں پہ گردِ ملال

گو یہ مدہوشیاں گناہ نہیں میری دنیا میں انکو راہ نہیں
میں تڑپ کو حیات کہتا ہوں ہر نفس کو برات کہتا ہوں
زندگی کو سکوں سے کیا مطلب
اس جنوں کو فسوں سے کیا مطلب

جلال و جمال

رقص کر اے دلِ خیال آلود　　یہ تری قیل و قال ہے بیسود
یوں دھڑک، دو جہاں مچل جائیں　　آسماں محوروں سے ٹل جائیں
کائنات اک بگولا بن جائے
کہکشاں ایک جھولا بن جائے

۱۹۴۲ء

تصویر کا دُوسرا رُخ

نہیں، ندیم، مجھے انتظارِ یار نہیں
خزاں زدہ ہوں مگر طالبِ بہار نہیں

فقط نگاہ پہ ہیں پردہ ہائے بُوقلموں
مجھے شکایتِ بیدادِ روزگار نہیں

یہ عقدے ناخنِ تدبیر سے کھلیں تو کھلیں
کہ مجھ کو اپنے مقدر پہ اعتبار نہیں

یہ رنگ و نور ہیں پردے رُخِ بصیرت پر
شفق کے رنگ بصارت کو سازگار نہیں

یہ تجلیاں ہیں ثبوت اس کھلی حقیقت کا
کہ خود مزاجِ مشیّت کو بھی قرار نہیں

یہ چیختے ہوئے طوفاں بتا رہے ہیں تجھے
کہ خاکِ راہ کے ذرّے ذلیل و خوار نہیں

یہ راز فاش کیا بے کراں دھندلکوں نے
تجلیات پہ کونین کا مدار نہیں

کنارِ غنچہ میں یہ نوکِ خار کہتی ہے
کہ معجزاتِ مشیّت کا کچھ شمار نہیں

یہ ظلمتیں ہیں کسی کے جمال کی تمہید
ندیم مصلحتِ حسن مجھ پہ بار نہیں

۱۹۴۲ء

تذبذب

کسی کو مل نہ سکی بارگاہِ ناز تری
مگر ازل سے اُسی کی تلاش جاری ہے
مرے خیال میں پرتو ہے تیرے جلووں کا
وہ اک خمار سا جو آگہی پہ طاری ہے
فقیہہ شہر کا اصرار ہے کہ یہ مستی
فقط فسردہ خیالی کی سحر کاری ہے
مری نگاہ میں لیکن وہ کانِ عرفاں بھی
گہر بدست سہی، روشنی سے عاری ہے

اگر نجوم میں تُو ہے تو چاند میں ہے کون؟
ترے جمال کی تقسیم ہو نہیں سکتی
ازل ابد کا تصوّر، فقط تصوّر ہے
ترے وجود کی تقویم ہو نہیں سکتی
حرم میں تُو ہے تو آخر کنشت میں ہے کون
کہ ایک ذات تو دو نیم ہو نہیں سکتی
جو قوّتیں ہیں تری منتشر، تو سچ کہہ دوں
کہ اِس جہان کی تنظیم ہو نہیں سکتی

اندھیرے غاروں میں اوہام لے گئے مجھ کو
نکل گئے مرے کافر تصوّرات کہاں
خدا وہ کیا ہے سمجھ لے جسے حقیر ادراک
کہاں خرد کی اڑانیں حریمِ ذات کہاں!

جلال و جمال

تو ذرّے ذرّے میں ہے اور کہیں نہیں ملتا ترے وجود پہ قیدِ تعینات کہاں

کہاں وہ زندہ و پائندہ حُسنِ لامحدود

مرے خیال کے دھندلے تاثرات کہاں

تجھے سمجھنے کی سب کوششیں ہیں بے معنی کہ میں ندیم کو بھی آج تک نہ جان سکا

فضول سا ہے یہاں تذکرہ حکیموں کا کہ اپنی روح کا کہنا بھی میں نہ مان سکا

جنوں ہے عرصۂ کون و مکاں کی سیّاحی کہ میں تو قلب کا ویرانہ تک نہ چھان سکا

مری حیات کی بنیاد ہے تذبذب پر

ہزار چاہا مگر جی میں کچھ نہ ٹھان سکا

۱۹۴۲ء

رات اور دن

ظلمتوں کی خلائے بے پایاں
خامشی کی زباں میں نغمہ کناں

زندگی پر سرور طاری ہے — خواب انگڑائیاں سی لیتے ہیں
نرم پا، ڈولتے، خنک جھونکے — بند کی کشتیوں کو کھیتے ہیں

کھیت مدہوش، وادیاں خاموش — پربتوں پر سکوتِ ہیبت ناک
گاہے گاہے ابھر کے مٹتا ہوا — اک ٹٹیری کا نغمۂ بے باک

جھاڑیوں میں یہ جگنوؤں کے ہجوم — راکھ کے ڈھیر میں شرارے سے
جھرنوں میں جھانکتے ہوئے تارے — دھندلے دھندلے سے پیارے پیارے سے

دفعتہً کانپنے لگا منظر — میرے احساس نے پھریری لی
زندگی کی غنودہ آنکھوں میں — ایک مشعل سی جھلملانے لگی

چار سو گھومتی ہوئی کیسی — ایک مبہم سی سنسناہٹ ہے
میری تنہائی سے الجھتا ہوا — کون آیا ہے؟ کس کی آہٹ ہے

خشک پتوں کا شور تھا شاید — یا خیالوں نے اپنے پر جھاڑے
کچھ نہیں۔ کچھ تو ہوگا! کوئی تو ہے! — جس نے پنجے خیال میں گاڑے

رات کی ظلمتیں سمٹ سی گئیں — خامشی کا طلسم ٹوٹ گیا
تھم گئے ہیں سفینے نیندوں کے — نغمۂ سازِ زندگی گونجا

اف یہ تغییر کا انوکھا کھیل — اف مشیت کا یہ اٹل قانون
ایک کی موت، دوسرے کی حیات — ہے سحر کی شراب، رات کا خون

ظلمتوں کا وہ کارواں ہے رواں
خامشی کی زباں میں نوحہ کناں

۱۹۴۲ء

وقت کا چکر

افق پر اجالے کی ابھری کماں
لرزتی ہوئی، زرفشاں، بیکراں

ستارے فلک پر لجا سے گئے
کنول جھیل پر تھرتھرا سے گئے

فضا چونک کر آنکھیں ملنے لگی
ہوا اینڈتی مڑتی چلنے لگی،

دھندلکوں سے پربت ابھرنے لگے
شفق کی ردائیں سنورنے لگے

وہ نکلی گپھاؤں سے ہرنوں کی ڈار
وہ کرلاتی کونجوں کی قوسی قطار

کہیں خاک پر رنگِ افلاک ہے
کہیں تیرگی پیرہن چاک ہے

ازل سے یہی کھیل کھیلا گیا
یونہی نوعِ انساں کو ریلا گیا

کہیں تیرگی ہے، کہیں نور ہے
انوکھا مشیت کا دستور ہے

سکوں خواب ہے، خواب ہے بے اساس
نہ مرنا ہے بس میں، نہ جینا ہے راس

نہ چھپتے ہیں تارے، نہ رکتا ہے چاند
نہ انوارِ خورشید ہوتے ہیں ماند

مری قوتوں کا نہیں کچھ شمار
کہ بوندوں سے میں نے نچوڑے شرار

مگر وقت پر بس نہیں چل سکا
قضا ٹل گئی، یہ نہیں ٹل سکا

۱۹۴۲ء

وقفے

بھٹک رہی ہیں ہوائیں، سسک رہے ہیں چراغ
کہیں شراب کے دھبے، کہیں شکستہ ایاغ

لہو کے داغ ہیں بکھرے ہوئے گلاب کے پھول
جمی ہے فرش پہ قالین کے مہین سی دھول

نہ زمزمے ہیں نہ میخوار ہیں نہ ساقی ہیں
لرزتی کانپتی پرچھائیاں سی باقی ہیں

یہاں وہاں سے اداسی سمٹتی آتی ہے
وہ خامشی ہے کہ ظلمت بھی سرسراتی ہے

ہوا کی چھیڑ سے جب پردہ پھڑپھڑاتا ہے
فضا میں بھوت سا اک تالیاں بجاتا ہے

معاً چمک کی پھواریں گریں ستاروں سے
فضا چھلکنے لگی ان شہاب پاروں سے

ہوا میں رقص کا احساس کسمسانے لگا،
وہ سُر چھڑے کہ زمانے کو وجد آنے لگا

بڑھا وہ ساقیٔ مہوش، وہ مے نواز اٹھے
سنبھالتے ہوئے نے کو وہ نے نواز اُٹھے

چراغ ہنسنے لگے، پھول مسکرانے لگے
سبو چھلکنے لگے، ساز گنگنانے لگے

سحر طلوع ہوئی، آسمان ڈھل سا گیا
جہاں پہ وقفۂ ظلمت کا راز کھل سا گیا

۱۹۴۲ء

ایک فلسفی دوست سے

نبض ادراک کہاں ڈوب چلی ؟ | جب نظر آئے مقاماتِ جمال
فکرِ ماضی میں رہوں کیوں مغموم | اب نگاہوں میں ہیں مستقبل و حال
عشق نے دل کو حرارت بخشی | عقل جینے کو سمجھتی تھی وبال
فلسفے میں ہے بہت گہرائی | مجھ کو بھاتی ہے مگر چشمِ غزال
نظریاتِ فلاطوں سے بلند | میری محبوبۂ خورشید جمال
زندگی خواب ہوئی جاتی ہے | آفریں، شعبدہ بازیِ خیال
امتیازاتِ من و تو کیا ہیں ؟ | فقط اوہام کے پھیلے ہوئے جال
مادّہ قہقہہ بن جاتا ہے | ذوق و وجدان ہوں جب شاملِ حال

پھول سے قطرۂ شبنم نہ گرے
فلسفی دوست، جوانی کو سنبھال

۱۹۴۲ء

یا چناں کُن یا چنیں

اف یہ ادراک و مشیت کی پرانی الجھن
اسی دیرینہ تنازع میں گذرتی ہے حیات

کبریا سے اسے انکار ہی لازم آیا
جب مقدر سے خرد کو نہ ملی راہِ نجات

پھر بھی جب گتھیاں اسرار کی حل ہو نہ سکیں
دور کی عشق نے ادراک پہ چھائی ہوئی رات

اب کہ احساس کے خاور سے فروزاں ہے وجود
جھلملاتے نظر آتے ہیں نئے لات و منات

چاہتا ہوں کہ طبیعت ہو سکوں پر مائل
دلِ بے خواب میں یہ رعشۂ سیماب نہ ہو

جم کے رہ جائے خیالات کا طوفانِ عظیم
اس سمندر میں کہیں حلقۂ گرداب نہ ہو

روح کے ساز میں اوّل تو نہ پیدا ہو صدا
اور پیدا ہو تو شرمندۂ مضراب نہ ہو

مرے احکام کی زد میں ہو خدائی ساری
میری دنیا میں کوئی چیز بھی نایاب نہ ہو

فیلسوفوں کی مچلتی ہوئی حکمت، لیکن
میرے اوہام کے شعلوں کو ہوا دیتی ہے

عقل جب تھک کے سرِ راہ گذر رک جائے
روحِ نادیدہ کوئی اس کو صدا دیتی ہے

بحر کے دھندلے کناروں پہ شفق کی سرخی
کتنے بے نام جزیروں کا پتا دیتی ہے

جلال و جمال

یک بیک قلب کو گھیرے ہوئے بادل کی کڑک
قصرِ تخئیل کی بنیاد ہلا دیتی ہے

میں کدھر جاؤں، کہاں روح کی تسکیں ڈھونڈوں
کیا مری زیست کا مقصد ہی پریشانی ہے
روح کہتی ہے، نئے دہر کی بنیاد رکھیں
اور لبوں پر گلۂ بے سروسامانی ہے
راز کھلتے ہی نئے راز ابھر آتے ہیں،
یعنی اسرار کا عرفان بھی حیرانی ہے

راستہ روک کے غراتی ہے وہموں کی سپاہ
گو مرے پاس ارادوں کی فراوانی ہے

اب تمنا ہے کہ مٹ جائے تذبذب کی خلش
جی میں جو آئے، وہی آخری منزل ہو جائے
امتیازات سے آزاد ہو احساسِ لطیف
حل کچھ اس طرح مرا عقدۂ مشکل ہو جائے
یا تو اک نشہ سا چھا جائے زمانے بھر پہ
زندگی وقت کے قانون سے غافل ہو جائے

یا ستاروں میں جہنم کے دہانے کھل جائیں
آسماں دہر کی تخریب پہ مائل ہو جائے

۱۹۴۲ء

پچھو رنگی

(پہلا رنگ)

جس نے بھی دیکھا ہے، ناچار پکار اٹھا ہے
"کاش اک بار پھر اک بار ادھر سے آئے"
ہو گئے چار طرف شوخ نگاہوں کے ہجوم
میں تو حیراں ہوں۔ وہ آئے تو کدھر سے آئے
لاج کی ماری لگی جاتی ہے دیوار کے ساتھ
کیا کرے حسن کا تقاضا ہے کہ شرما کے چلو
انگلیاں تک نظر آئیں نہ کسی راہی کو
کالے کھدر کے دوپٹے کو نہ لہرا کے چلو

(دوسرا رنگ)

جس نے بھی دیکھا ہے، ناچار پکار اٹھا ہے
"اف یہ بیباک نگاہی، یہ بھبھوکا چہرہ
کس کی آنکھوں پہ یہ زلفوں کی گھٹا چھائیگی
کس کی قسمت میں ہے یہ لا تمنا ہی سہرا"
یوں چلی جاتی ہے، جیسے کوئی آوارہ غزال
جس کو صحراؤں کی پہنائیاں دہلا نہ سکیں
یوں اٹھاتی ہے قدم، جیسے کوئی شہزادی
جس کو ایوانوں کی رعنائیاں بہلا نہ سکیں

(تیسرا رنگ)

جس نے بھی دیکھا ہے، ناچار پکار اٹھا ہے
"مضمحل کیوں نظر آتی ہے یہ سیماب سرشت!
پاؤں اٹھتے ہیں کہ جھکراتی ہے دنیائے جمال
بال اڑتے ہیں کہ جلتا ہے جوانی کا بہشت!
آج ان آنکھوں میں وہ شعلہ جوالہ نہیں
جس نے بے مایہ چراغوں کو ابھرنے نہ دیا

ناخدائی کا وہ انداز نہیں، جس نے ہمیں
عین طوفان میں بھی ساحل پہ اترنے نہ دیا

(چوتھا رنگ)

اب کے جو دیکھے، وہ انگشت بدنداں رہ جائے
میں مگر کب سے سمجھتا ہوں معمائے حیات

حُسن اگر رنگ نہ بدلے جو جوانی مٹ جائے
دن کو دن کون کہے دن کو جو حاصل ہو ثبات

بھوسلے بالوں کو چادر میں چھپاتی خاتون!
کاش تجھ کو بھی ان اسرار کا عرفاں ہوتا

تو اگر جانتی۔ فطرت کے کھلونے ہیں ہم
اپنے ماضی پہ ترا قلب نہ گریاں ہوتا

نوعِ انساں کو نشیبوں سے اُبھارا نہ گیا
بس یہی نقش مشیّت سے سنوارا نہ گیا

۱۹۴۳ء

ایک یاد

(افضل کی خودکشی سے متاثر ہوکر)

وقت کی زلف کے خم کون گنے، کون گنے
پیچ در پیچ ہے یہ سلسلۂ لیل و نہار
زلزلہ، قحط، وبا، معرکۂ جنگ و جدل
معجزہ ہائے مشیّت کا ہے دشوار شمار

کون تاریخ میں بکھری ہوئی لاشیں ڈھونڈے
کہ تعفّن سے ہے لبریز یہ ایوانِ قدیم
آدمِ اخلاق کے غاروں سے اُٹھا، پر نہ اُٹھا
سعیِ ناکام کا افسانہ ہے یہ فنِ سلیم

ٹوٹے پھوٹے ہوئے اصنام کے بھونڈے انبار
آنکھیں پتھرائی ہوئی، مردنیاں چھائی ہوئی
مردہ تہذیب کے بوسیدہ عجائب گھر میں
وقت کی آہنی زنجیر ہے بل کھائی ہوئی

تیرہ و تار ہے ماضی کا شبستانِ جمال
جس کو یادوں کی چڑیلوں نے بسا رکھا ہے
کئی اسرار کے انبار، کہ جن کا افشا
علمِ یزداں نے قیامت پہ اٹھا رکھا ہے

وقت کے چرخ پہ صدیوں کی گھٹا چھائی ہے
لیکن اس محشرِ خاموش میں اک پیکرِ نور

جلال و جمال

گو گرفتار ہے اک حلقۂ ظلمت میں مگر
میری مایوس نگاہی کا سہارا ہے ضرور

زہر نے جس کی محبّت کو بقا بخشی تھی
جس نے تقدیر کے جبڑے سے لہو برسایا
آخری وقت مجھے جس نے کہا تھا۔ "اے دوست
تیرے دم سے مجھے اب تک نہ خدا یاد آیا!"

۱۹۴۳ء

پہلی موت

عروسِ زندگی کے رنگ ڈھل گئے
تری صباحتوں کے راز کھل گئے

دریچۂ امید بند ہو چکا
خیال اپنے دائروں میں کھو چکا

ترا مقام تیرگی پسند ہے
مری طلب تمام زہر خند ہے

نہ ولولے، نہ غم، نہ بے قراریاں
نہ تیری بے رخی کی سحر کاریاں

عجیب زندگی ہے مرگِ زندگی
ہرا ہُوا ہے جل کے برگِ زندگی

مگر یہ کھوئی کھوئی رات کیا کروں
یہ بھیگی یعنی روتی رات، کیا کروں

خلاؤں ہیں یہ ظلمتوں کی تالیاں
یہ بجلیاں، یہ جھینگروں کی بالیاں

یہ سسکیوں کی سنسنی ہواؤں ہیں
یہ زلزلوں کی تھرتھری فضاؤں ہیں

سکونِ جاوداں خیالِ خام تھا
قرار بے قراریوں کا نام تھا

شباب اپنا کام ختم کر گیا
شعور رہ گیا، ندیم مر گیا

۱۹۴۳ء

رازِ حیات

زندگی راز ہی سہی ہمدم

لیکن اس راز کا وجود ہے کیوں؟
آگ مفقود ہے تو دود ہے کیوں؟
یہ کلی شاخ سے ہے کیوں محروم!
چاند کی چاندنی ہے کیوں معدوم!
زندگی ہے فقط فریبِ نگاہ
چرخ پہ جس طرح نجوم کی راہ
روح کا اضطراب رازِ حیات
قلب کا پیچ و تاب رازِ حیات
جو تڑپ روح کے خمیر میں ہے
وہی انسان کے ضمیر میں ہے
نسلِ آدم عذاب کیوں سہتی
زندگی راز ہی اگر رہتی

زندگی راز ہی سہی ہمدم

۱۹۴۳ء

دھڑکن

پھر طوفاں کا پرجوش سپاہی پربت پربت گھوما
ذرّوں نے گردوں چوما
پھر ابر افق پر کڑکا پھر قلبِ مشیّت دھڑکا

پھر روحوں کے ایوانوں میں جھانجن کی جھن جھن گونجی
چھاگل کی چھن چھن گونجی
پائل کا کلیجہ پھڑکا پھر قلبِ مشیّت دھڑکا

امیدوں کے چپ چاپ افق پر ہنستا گاتا آیا
تیروں کو سجاتا آیا
یونان کا اندھا لڑکا پھر قلبِ مشیّت دھڑکا

سنگیں پیکر آئینہ گروں کے محلوں سے ٹکرائے

آئینہ گر چلّائے

اور سنگ سے شعلہ بھڑکا   پھر قلبِ مشیّت دھڑکا

ان دیکھے ان جانے ہاتھوں نے رات کا پردا نوچا

ظلمت کا گلا دبوچا

پورب کا دریچہ کھڑکا   پھر قلبِ مشیّت دھڑکا

۱۹۴۳ء

یوٹوپیا[1]

میں نے جس دَور کی تصویر دکھائی ہے تجھے

وہ ابھی وقت کے پردوں میں ہے پابندِ جمود
ابھی تخ بستہ فضاؤں میں ہے شہ پارہ عود
ابھی خاکسترِ ماضی میں نہاں ہے وہ گہر
ابھی دوزخ ہے تصور کا، وہ فردوسِ نظر
ابھی انگڑائی سے عاری ہے وہ حسنِ مدہوش
ابھی اس بحر کو معلوم نہیں لطفِ خروش
ابھی اس لَو سے فروزاں ہے فقط میرا دماغ
ابھی اس نور سے ملتا نہیں ساحل کا سراغ

میں نے جس دَور کی امید دلائی ہے تجھے

وہ تری شعلہ مزاجی سے جلا پائے گا
تیرے انفاس کے جھونکوں سے نکھر جائے گا

---

[1] UTOPIA - ایک مکمل مثالی سیاسی اور تمدنی نظام۔

بحرِ ذخّار سے الجھے گا ترا عزمِ صمیم
کہ ابھی دور ہے آزاد دی کی اقلیم
یہ سفر حرّیتِ قلب و نظر چاہے گا
شیر کا حوصلہ، شاہیں کا جگر چاہے گا
میرے اشعار کی محتاج نہیں اس کی نمود
تیری یلغار ہے اس عقدۂ مشکل کی کشود
میں نے ہلکی سی جھلک جس کی دکھائی ہے تجھے

۱۹۴۳ء

پرتوِ آرزو

اعترافِ شکست ممکن ہے
لیکن اسرار فاش ہوتے ہیں
مل ہی جائے گی منزلِ مقصود
ہم تو محوِ تلاش ہوتے ہیں

راہ ناپید۔ راہبر حیران
کاروانِ تشنہ لب۔ شکستہ دماغ
زیست آلام سے عبارت ہے
آندھیوں میں بھڑک اٹھیں گے چراغ

دُور تک کپکپا رہے ہیں سراب
بھاپ سی اٹھ رہی ہے ٹیلوں سے
عشق کی پیاس بجھ نہیں سکتی
باغِ جنت کی سلسبیلوں سے

ان دہکتی ہوئی فضاؤں میں،
ایک پرچھائیں سی ہے رقص کناں
جس کی پازیب کے چھناکے پر
ہے ازل سے نظامِ دہر رواں

سست انگڑائیوں کا ایک ہجوم
باہوں کے لوچ میں کنول کا بل
پتلیوں میں دیئے سے جلتے ہوئے
لانبی پلکوں کی اوٹ میں کاجل

گاہ تیزی سے یوں لپکتی ہوئی جیسے ارجن کا سرسراتا تیر
گاہ یوں رک کے پیچ کھاتی ہوئی جیسے دم توڑتا ہوا نخچیر

یہ مری آرزو کا پرتو ہے میرے اوہام کا غبار نہیں
یہ وہی لَو ہے شمعِ ہستی کی جس کی تقدیر میں قرار نہیں

میں تھکن سے نڈھال ہوں لیکن کیوں ادھورا رہے سفر میرا
تب کروں گا میں اعترافِ شکست
موت جب تھام لے گی سر میرا

۱۹۴۳ء

ایک عیّاش دوست سے

فسونِ ماہ و انجم سے میں دھوکا کھا نہیں سکتا
مری تخئیل سے ذرّہ بھی بچ کر جا نہیں سکتا

نہ جانے مدعائے جبر کی تاویل کیا ہوگی
اگر تو میری مجبوری کا مقصد پا نہیں سکتا

جہاں میری محبت کھیلتی ہنستی رہی برسوں
تصور میں بھی تو ان منزلوں کو لا نہیں سکتا

دلِ انساں پہ قانونِ فنا کی زد نہیں پڑتی
یہ غنچہ خاک میں ملتا تو ہے، کملا نہیں سکتا

مری پرواز سے لبریز ہیں کون و مکاں لیکن
ترا ادراک میرے شہپروں کو پا نہیں سکتا

اب اس سے بڑھ کے میرے عشق کی معراج کیا ہوگی
بغیر اس کی رضا کے آنکھ تک جھپکا نہیں سکتا

زمانہ برسرِ پیکار ہے کیوں عزمِ شاعر سے
یہ وہ دامن ہے جو آندھی میں بھی لہرا نہیں سکتا

مجھے مجبور کیوں کرتا ہے تو عیشِ دو عالم پر
کہ میں نازک گلوں پر بجلیاں برسا نہیں سکتا

۱۹۴۳ء

خورشید احمد خاںؔ سے

کھیلتا ہے ترا ادراک ان اسرار سے کیوں
جن کا اسرار ہی رہنا ہے تقاضائے حیات

ان دھندلکوں میں بھٹکتا ہے ترا طائرِ فکر
جن میں کچھ اور الجھتا ہے معمائے حیات

ریزۂ سنگ سہی، پھول کی نازک پتّی
تودۂ خاک سہی، پیکرِ ابنِ آدم

ذرّۂ ریگ سہی، قلب کا ایوانِ حسیں
قطرۂ بحر سہی، وسعتِ ہر دو عالم

یہ جہاں خواب سہی، ایک پریشان سا خواب
جس کی تعبیر ہے اک تیرہ و تاریک خلا

جس کی پہنائی میں اڑتے ہیں وہ ننگے بھتنے
نوعِ انساں کے کلیجے ہیں فقط جن کی غذا

اے مرے دوست، مرے شعر کے متوالے دوست
تیری ہر بات کو تسلیم کیے لیتا ہوں

میرے احساس کے خاور، مرے رازوں کے امیں
تیرے کہنے پہ میں یہ زہر پیے لیتا ہوں

لہ مصنف کے ایک عزیز دوست جو فلسفہ کے ایم۔ اے ہیں۔ اور جنہیں فلسفہ کے ہر پہلو پر انتہا درجہ کا عبور حاصل ہے۔

میں نے احساس کی میزان میں تولی ہے حیات
میں نے تخئیل کے سانچے میں جوانی ڈھالی
میں نے افکار کی بکھری ہوئی مہکاروں میں
تیرے بھٹکے ہوئے ادراک کی منزل پالی

فلسفہ چیخ ہے اس وہم گزیدہ دل کی
جس کے اندازِ تفکر میں کوئی ضبط نہیں
فلسفہ ہچکی ہے اس سازِ شبستانی کی
جس کے دلدوز ترانوں میں کوئی ربط نہیں

فلسفہ ٹیس ہے ان روح کے ناسوروں کی
جن کو رہنا ہے سدا جبرِ مشیت کا گلہ
فلسفہ ہوک ہے ادراک کے ان زخموں کی
فیلسوفوں سے کبھی جن کا مداوا نہ ہوا

سوچنا ہے تو مرے شعر کے ایوان میں آ
جس میں رازوں کو حجابوں سے بلا کی کد ہے
چھائے رہتے ہیں جہاں مست خیالوں کے خمار
بحث و تکرار، نہ افسانۂ نیک و بد ہے

بنسری عشق کی بجتی ہے تو آہنگ کے ساتھ
پھڑپھڑاتے ہیں بہشتوں میں فرشتوں کے پرے
جھلملاتے ہیں در و بام پہ انوارِ یقیں
راکھ ہو جاتے ہیں اوہام سرشتوں کے پرے

جامِ جمشید سے شفاف ہے جب روحِ ندیم
پھر ترا عقل کے جنگل میں بھٹکنا کیسا
جب یہاں ہیں گل و نسرین و سمن کے انبار
پھر ترے قلب میں کانٹوں کا کھٹکنا کیسا

کانٹ کی فکر میں الجھا نہ خیالات اپنے
کہ ترا ذہن ہے اک شعرِ حسین کا محتاج

جس کے بجتے ہوئے الفاظ سے اک آنچ اٹھے
موم ہو جائے ترے علم کا یخ بستہ مزاج

شمعِ عرفاں سے نہ ڈر، نار نہیں، نور ہے یہ
شمع ناچے گی جب آئیں گے یہ پروانے دو

اصطلاحات کی چھٹ جائیں گی سب تیرگیاں
”خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو“

۱۹۴۳ء

کروٹیں

کتنے ادوار سے گذرا ہے شباب
عشق، امید، تذبذب، انجام

ذرّے ذرّے میں خیالی فردوس
یعنی ہر گام پہ اوہام کے دام

ایک مرکز پہ دھڑکتی تھی حیات
"دست بر سینہ، نظر بر لبِ بام

مجھ کو محسوس ہوا کرتا تھا
اپنے اشکوں میں ستاروں کا خرام

مضمحل سوچ میں لپٹی ہوئی صبح
دلِ بافکر میں ڈوبی ہوئی شام

گنگناتے ہوئے جھرنے کے قریب
کسمساتا ہوا اک پیکرِ نور

وہ شفق رنگ لبوں کی لرزش
جیسے موسیٰ کے خیالوں میں طور

رُخ پہ گیسوئے طلائی کی وہ لٹ
جیسے آکاش کے رمنوں میں حور

سمٹی باہوں میں لپٹنے کی امنگ
جیسے کلیوں میں چٹکنے کا شعور

مسکراہٹ میں محبت کی کسک
تلملاہٹ میں جوانی کا غرور

میں نے اِس عالمِ مدہوشی میں
منجمد وقت کا دھارا دیکھا

جب کبھی غور کیا دنیا پر ایک آوارہ ستارہ دیکھا
میں نے آفاق کی پہنائی میں حسن کو انجمن آرا دیکھا
اس قدر تند تھا سیلابِ شباب نہ سفینہ، نہ کنارا دیکھا

ایک دن حسن سے نظریں جو ہٹیں
قلبِ ہستی کو دوبارہ دیکھا

اک طرف رقص کی بجلی چمکی اک طرف آہ کا شعلہ بھڑکا
اک طرف تھاپ پڑی طبلے پر اک طرف بھوک کا بادل کڑکا
زلفیں لہرائیں — ہوائیں مہکیں ہونٹ تھرّائے — کلیجہ بھڑکا
بھاؤ کچھ اور چڑھے — مے چھلکی فصلیں تیار ہوئیں — دل دھڑکا

سانس لیتا رہا پھر بھی انساں
اندھی فطرت کا مجاہد لڑکا

شاعری حسنِ بیاں تک محدود فلسفہ ہرزہ سرائی کا شکار
سرفروشوں پہ سلاسل کی گرفت سورماؤں پہ سیاست کا غبار
نوجوانوں کے ارادے بے رنگ جیسے صحراؤں میں شہیدوں کے مزار
غم کی ماری ہوئی دوشیزائیں شب کے سناٹے میں جیسے گلزار

زندگی غیر مسلسل مستی
موت کا خوف مسلسل آزار

نہ تدبر سے مقدر کو غرض نہ مشیت سے مرا یارانہ
مجھ پہ ابلیس نے ڈورے ڈالے مجھ سے یزداں بھی رہا بیگانہ
کب تک احساس کو محصور رکھے خشک اسرار کا تانا بانا
کہکشاں اب ہے مری منزلِ شوق کہ بہت چھان لیا ویرانہ
مصلحت یہ ہے، کہ تخلیق کروں
نئے مے نوش، نیا مے خانہ

مژدہ اے عالمِ نو کے خوابو! مائلِ خیر ہے انساں کا شرف
اس میں کچھ دوش کمانوں کا نہیں میرے تیروں سے گریزاں تھا ہدف
دل کی دھڑکن وہ نشیبوں سے اٹھی محوِ پرواز ہے تاروں کی طرف
حدتِ حبس سے زنداں ٹوٹا، اپنے موتی کو اچھالے گا صدف
گردشِ چرخ خبردار رہے
اب مرا عزم ہے تقدیر بکف

۱۹۴۲ء

واپسی

اپنے افکار کی گستاخ اڑانوں کے طفیل بارہا دیکھے ہیں تاروں کے نشیمن میں نے
جن کو حوروں نے مہ و مہر کی کرنوں سے بُنا اپنے اشکوں سے بھگوئے ہیں وہ دامن میں نے
اپنی نظروں کو مئے عشق سے صیقل کر کے کھ لئے گنبدِ گردوں میں بھی روزن میں نے
ٹمٹمانے لگے ایوانِ مشیت کے چراغ جب کیا روح کے فانوس کو روشن میں نے

لیکن افسوس — ان اسرار کے سلجھانے سے
اور الجھائی ہے تقدیر کی الجھن میں نے

فرش کے راز بھلا عرش پہ کیسے کھلتے درحقیقت مری پرواز، تن آسانی تھی
خاک سے جانبِ افلاک اچھالا جس نے وہ پراگندہ خیالوں کی پریشانی تھی
پھڑپھڑاہٹ مرے شہپر کی جسے تو سمجھا میری افسردہ امیدوں کی پر افشانی تھی
میں جسے دیکھ کے پھر سوئے زمیں لوٹ آیا آئینہ خانۂ فردوس کی حیرانی تھی

بس گئیں جس میں تخیل کی کئی دنیائیں
چرخ پر بھی اسی پیکر کی ستمرانی تھی

ان پراسرار خلاؤں میں ہے اڑنا بیکار جن کے پیچھے ہے وہی کہنہ و فرسودہ نظام

وہی ہنگامۂ تغییر، وہی قیدِ شکست
صبح کے دوش پہ اکھڑے ہوئے تاروں کے خیام

وہی یزداں، وہی مجبور ہیولوں کے سجود
وہی ایمان کے لالچ میں درود اور سلام

وہی پابندیٔ پیہم، وہی زندانِ بہشت
وہی بجلی، وہی خرمن، وہی دانہ، وہی دام

میں تو کہتا ہوں کہ لازم نہیں دنیا سے گریز
جب کسی چیز کو حاصل نہیں عالم میں دوام

چشمِ بینا میں یہ سیّارۂ رقصاں میرا
عرش کے معبدِ خاموش کو شرماتا ہے

جھرنے بن جاتے ہیں باریک گلابی ڈورے
پھر جب پھسلی غاروں میں پھسل جاتا ہے

بحر میں، بن میں، پہاڑوں میں بستے ہیں گلاب
جب نئی صبح کا سیلاب امڈ آتا ہے

کارخانوں سے ابلتا ہوا پرپیچ دھواں
فتنۂ شہر کو انگڑائی پہ اکساتا ہے

سبز کھیتوں کی لہکتی ہوئی ہریاول سے
قلبِ دوشیزۂ صحرا کئی بل کھاتا ہے

کتنے ہنگاموں کا مرکز ہے مری بزمِ حسیں
کتنی مستی سے ہے لبریز مرا ساغرِ زر

کتنے دل لذتِ نظارہ سے کانپ اٹھتے ہیں
کپکپاتی ہوئی چلمن کا اشارا پا کر

کتنی پلکوں پہ چمکتے ہیں وہ لرزاں تارے
جو ٹپکتے ہیں تمناؤں کی خاکستر پر

کتنے راہی ہیں پراسرار سی راہوں پہ رواں
جو نہیں جانتے خود بھی کہ رواں ہیں کدھر

کتنی شمعیں ہیں جو اجڑے ہوئے محلوں میں جلیں
کتنے گھر چشمکِ انجم کے رہے دست نگر

جلال و جمال

سرِ کہسار، سسکتا ہوا کمزور سا چاند
میری دنیا سے بچھڑتے ہوئے گھبراتا ہے

جانتا ہے کہ وہ مبہوت فرشتوں کا حرم
ان نشیبوں کی بلندی پہ چلا جاتا ہے

اب بھی کرنوں کے سہارے سے کوئی پیکرِ نور
عرش سے وادیِ سینا میں اتر آیا ہے

اب بھی جبریل، ستاروں کے اٹھا کر پردے
بحر و بر پر شبِ خاموش میں منڈلاتا ہے

اب بھی افلاک پہ دبکا ہوا گلزارِ جناں
خاک سے آنکھ ملاتے ہوئے شرماتا ہے

میں نے قطرے میں بھی سیلاب کی چنگھاڑ سنی
میں نے ذرّے کے دہن میں بھی زباں دیکھی ہے

جس حقیقت سے مہ و مہر بھی بیگانہ رہے
دھندلے دھندلے سے دریچوں میں عیاں دیکھی ہے

وہ تڑپ جس کا ستاروں نے کیا تھا دعوےٰ
ننھے سے پھول کے ریشوں میں رواں دیکھی ہے

جس تجلی سے عبارت ہیں اڑانیں میری
اپنے احساس کے غرفے میں نہاں دیکھی ہے

منحصر ہے مری دنیا پہ نظامِ کونین
میں نے یزداں کی بھی چشمِ نگراں دیکھی ہے

۱۹۴۳ء

بھور آئی

اندھیارے کا درپن ٹوٹا پورب نے پو برسائی
انگارے کا جھومر پہنے اوشا نے لی انگڑائی
جنگل مہکے، پنچھی چہکے، لہکی بہکی پروائی
بھور آئی

رکی رکی سی، جھکی جھکی سی، دکھی دکھی سی آشائیں
مچل مچل کے، اچھل اچھل کے، گگن جھروکے چھو آئیں
من میں سپنوں کی مہارانی من ہی من میں اترائی
بھور آئی

دھوآں دھار پچھم کی بستی، دھڑ دھڑ پورب دیش جلے
سورج دیوتا، گھات لگائے رات کی دیوی ہات ملے
کرنوں کی گوپی کہرے میں کانپ کے چلائی
بھور آئی

۱۹۴۳ء

سلونی شامیں

سرمئی شام فضاؤں میں گھلی جاتی ہے
پھڑکے دیتے ہیں خلاؤں میں ستارے افشاں

دور پچھم میں سمٹتے ہوئے پربت سے پرے
ایک مبہوت حسینہ ہے ابھی رقص کناں

خامشی پی گئی چھاگل کے چھنا کے، لیکن
پھڑپھڑاتا ہے دھندلکوں میں شہابی داماں

کائنات ایک پہیلی سی بنی جاتی ہے
نہ حجابوں کے تکلف، نہ جمالِ عریاں

خواب آلود ہواؤں میں رواں ہیں یوں پل
جیسے اڑتے ہوئے تیروں کے منور پیکاں

جھلملا اٹھے ہیں سڑکوں کے کلیجوں میں دیئے
تشنہ ذہنوں میں ہوں جس طرح امارت کے خیال

یوں چھلکتی ہیں دریچوں سے لرزتی کرنیں
جیسے افسردگیٔ حال پہ ماضی کا جلال

خوابگاہوں میں کچھ اس طرح کنیزیں گم ہیں
جیسے گھر جائیں کسی کھوہ میں آوارہ غزال

ایک اسٹیج پہ ہیں گرسنہ نظروں کے ہجوم
جانے کب آئے گی رقاصۂ سیماب خصال

زہد آشام نگاہوں سے یہ کہتا ہے فقیہہ
"جاؤ درگاہ میں لے آؤ سریلے قوال"

عشق کرتا ہوں کہ پانی سے شرر چنتا ہوں
فاقہ مستی میں امنگوں کو سکوں خاک ملے!

میں نے تسکین کی خواہش میں جنہیں تھاما تھا
آنسوؤں سے وہی دامن مجھے نمناک ملے!
وسعتیں میرے جنوں کی نہ کسی نے سمجھیں
چارہ گر بھی مجھے وارفتۂ ادراک ملے!
ہمسفر پائے، مگر دل کو تسلی نہ ہوئی
روحیں بے باک سہی! ذہن مگر چاک ملے!
اپنی منزل تو معین تھی، مگر کیا کرتا
ہر قدم پر وہی ابہام کے پیچاک ملے!

جذبۂ دل نے کہا ــــ جرأتِ رندانہ کر
میرا ماحول پکارا کہ ــــ گنہگار نہ بن
میں نے جب عشق کے فانوس جلانے چاہے
تو عزیزوں نے صدا دی کہ ــ شب تار نہ بن
تنکے گلیوں سے اٹھائے تو یہ آواز آئی ــ
چشمِ احباب میں اس درجہ سبکسار نہ بن
آتشیں گیت مرے سن کر بزرگوں نے کہا ــ
بزمِ امروز میں فردا کا خریدار نہ بن
میرے افکار مگر مجھ سے یہی کہتے ہیں ــ
روحِ اسلاف کی لعنت کا سزاوار نہ بن

مجھ سے شاموں کی تباہی نہیں دیکھی جاتی
میری محبوب! زمانے کی روش بھول بھی جا
دیکھ وہ چرخ کی ظلمت زدہ پہنائی میں
گیت گاتے ہوئے ابھرے ہیں ستارے کیا کیا
دورِ حاضر کی تجلی ہے بصیرت کا فریب
خون میں کھیلنے والوں کا بہانہ ہے حنا
ہم کو جو کہنا ہے وہ کیوں نہ کہیں؟ کیوں نہ کہیں؟
عشق شوریدہ تو ہے، پھر غمِ رسوائی کیا!
اب تو ماحول کی زنجیر گلی جاتی ہے
بل پہ بل کھاتے ہیں فرسودہ تمدن کے خدا

ہم جوانی کو تذبذب میں نہ گھلنے دیں گے — ہم نہ رکھیں گے غریبوں کو غنی کا محتاج
ہم چٹانوں کے کلیجوں میں علم گاڑیں گے — چشمِ احرار میں جچتے نہیں خوش رنگ زجاج
روحِ انساں کے تقدس کو نہ ہم بھولیں گے — ہم نہ مانگیں گے غریبوں سے غریبی کا خراج
ہم نہ ڈالیں گے حکومت پہ ریا کے پردے — نہ کوئی قصر نہ درباں نہ کوئی تخت نہ تاج

میری محبوب! یہ چپ چاپ سلونی شامیں
آج کے بھیس میں دکھلاتی ہیں کل کی معراج

۱۹۴۳ء

یہ فلسفی

کبھی گمان ہے ذروں پہ کائناتوں کا
کبھی خیال بھٹکنے لگا خلاؤں میں

کبھی یہ سوز، کہ دھوکا ہے آفرینشِ دہر
کبھی یہ ساز، کہ کچھ راز ہیں ہواؤں میں

کبھی بیان کی سب قوتیں رہیں مرکوز
خیال و خواب کے ڈھالے ہوئے خداؤں میں

کبھی یہ درد کہ دشوار ہے حصولِ سکوں
رقابتیں ہیں عناصر کے دیوتاؤں میں

کبھی یقین سے تلقینِ کوششِ پیہم
کبھی شکوک کی آمیزشیں دعاؤں میں

کبھی شعور پہ تحت الشعور کا افسوں
ہوس کے رنگ خواتین کی حیاؤں میں

کبھی غدود میں اسرارِ ارتقائے حیات
کبھی شمار ہے دل کا جہاں نماؤں میں

کبھی ہے مادہ، روحانیت کی لوحِ مزار

جلال و جمال

کبھی ہے روح دو عالم کے کبریاؤں میں

کبھی یہ حکم کہ جمہوریت ہے راہِ نجات

کبھی پناہیں شہنشاؤں کی قباؤں میں

کبھی یہ قول، تغیّر ہے زندگی کا ثبوت

کبھی یہ وہم، حقیقت ہے پارساؤں میں

کبھی سماج کی زنجیر پر کڑی تنقید

کبھی رواج کی گنتی ہے کیمیاؤں میں

کبھی گناہ پہ الزامِ انحطاطِ حیات

کبھی حیات کی رعنائیاں خطاؤں میں

کبھی غرور، امیروں کی ہمنشینی پہ

کبھی سرور غریبوں کی التجاؤں میں

کبھی یہ شور کہ منزل قریب آپہنچی

کبھی گلے، کہ ابھی بیڑیاں ہیں پاؤں میں

"میں جانتا ہوں" "میں جانوں گا" "میں نہ جان سکا"

یہ غلغلے ہیں ان اسرار کے گداؤں میں

اگرچہ جنّتِ عرفاں بہت بلند نہیں

ندیمؔ! فلسفہ پرواز ہے، زقند نہیں

۱۹۴۴ء

ثبوت

دم بخود رات منتظر تارے
کائنات ایک خواب، ایک خیال
پتلے جھرنے کا سرمئی پانی
اک حقیقت، مگر فریب مآل

نیم افسردہ نیم کی ٹہنی
قوس بن کر تنے کو چومتی ہے
ایک بھٹکی ہوئی پریشاں چیل
پیچ کھا کر فضا میں گھومتی ہے

گھاس میں اوس کی گھلاوٹ ہے
نرمیاں خنکیوں کے بس میں ہیں
پتی ڈرتی ہے، قطرہ ناچتا ہے
یہ چمن کی قدیم رسمیں ہیں

ناگہاں کہکشاں کماں بن کر
تن گئی — دیر تک تنی ہی رہی
ایک انگڑائی سی بنی لیکن
ایک انگڑائی سی بنی ہی رہی

کتنی شدت ہے اس تناؤ میں
اف وہ انگڑائی جو نہ ٹوٹ سکے
انتظار! انتظار! — سناٹا!
ہائے وہ تیر جو نہ چھوٹ سکے

جلال و جمال

آسمانوں میں اور زمینوں پر — زندگی تھم گئی، کہ تیر چلا
اور پھر پو پھٹے، ستاروں کا — آخری مضمحل سفیر چلا

وقت کو تیر ہی نہیں ملتا — یا ہدف کا کہیں وجود نہیں
ورنہ یہ ہمہمہ — یہ خاموشی! — ایک ہنگامہ ہے، سرود نہیں

اور کچھ غور کر ستارہ نشیں — اس گہر کو ابھی کچھ اور تراش
اس کے اک رخ میں سرسراتی ہوئی — نظر آتی ہے بے بسی کی خراش

بے بسی؟ — بے بسی؟ — پناہ بخدا — آسماں بج اٹھے — توانگ توانگ!
پوربی دائرے سے تیر چلا
تیرگی نے بھری سنہری مانگ

۱۹۴۴ء

وحدت

دائرہ ایک ہے، انجام بھی، آغاز بھی ایک
دشتِ ناپید کنار
ایک ہی راہگذار
ذوقِ پرواز بھی، پرواز کا انداز بھی ایک

یہ ہوائیں یہ فضائیں یہ خلائیں یہ فلک
یہ مہ و مہر کے داغ
یہ عناصر کے چراغ
ان کی نبضوں سے ہم آہنگ ہے کلیوں کی چٹک

ایک زنجیر میں مربوط ہیں کتنی کڑیاں
چاند آیا لبِ بام
دیکھ موجوں کا خرام
کرنیں لہراتی ہیں سیپیوں کی منور لڑیاں

رنگ اور نسل کی الجھن میں بھٹک جاتے ہیں
یہ فقیہوں کے امام
یہ رواجوں کے غلام
مردہ تہذیب کے حجروں میں سکوں پاتے ہیں

اس طرف دعویٰ آزادیِ نوعِ انساں
اس طرف سوچ بچار
اپنے دعووں سے فرار
ایک پھنکار — سخاوت کا ابھی وقت کہاں

امتیازات نے وحدت کا دبوچا ہے گلا
تارے ٹکرانے لگے
زلزلے آنے لگے
وہ مشیت کی کماں تن کے بجی — تیر چلا!

۱۹۴۴ء

آرزو کا کھیل

رات کی خموشی میں کائنات روتی ہے ‏ ‏ ‏ چاند اس کی آنکھوں کا آبدار موتی ہے

میٹھی نیند سوتے ہیں زندگی کے ہنگامے ‏ ‏ ‏ وقت لڑکھڑاتا ہے حال کا علم تھامے

ایک مرمریں بدلی چاند کے قریب آئی ‏ ‏ ‏ چومتے ہی لب اس کے مسکرائی، لہرائی

یاد کے دریچوں میں کانپنے لگا ماضی ‏ ‏ ‏ میری تیز سانسوں میں ہانپنے لگا ماضی

ابر کے گریباں میں تارہ جھلملایا ہے

ذہن میں دبے پاؤں جانے کون آیا ہے

روئی روئی آنکھوں میں سوئی سوئی مستی ہے ‏ ‏ ‏ خلد کے جزیروں پہ نیند سی برستی ہے

ڈھیر سا ہے شانوں پہ بکھرے بکھرے بالوں کا ‏ ‏ ‏ اک غبار سا جیسے ذہن پر خیالوں کا

نطق کی بغاوت پر ہونٹ پھڑپھڑاتے ہیں ‏ ‏ ‏ جیسے نرم جھونکوں سے پھول کانپ جاتے ہیں

معبدوں کی محرابیں اس کے بازوؤں کے خم ‏ ‏ ‏ جوئے آب میں تارے اس کے دیدۂ پرنم

گاہے گاہے کچھ ایسے تھم کے لڑکھڑاتی ہے

جیسے نیم کی ڈالی جھول جھوم جاتی ہے

جلال و جمال

عالمِ جوانی میں کتنے خواب دیکھے تھے
جن سے بحر شرمائیں وہ سراب دیکھے تھے

کتنے بوستاں سینچے، کتنے بن بسائے تھے
آنسوؤں کے تاروں سے آسماں سجائے تھے

اک ندیم کی دھن میں شاہراہیں چھانی تھیں
اک اڑان میں کتنی جلوہ گاہیں چھانی تھیں

قہقہے سے گونج اٹھے جب فلک نژادوں کے
دب کے رہ گئے سارے ولولے ارادوں کے

بجلیوں کے ایواں ہیں آگ کے بچھونے ہیں
آرزو کھلاڑی ہے، آدمی کھلونے ہیں

۱۹۴۴ء

شکنجے

کیا کہوں چاند کی گردش پہ خیال آرائی
کہ مرے سامنے انسان کی تقدیر بھی ہے

کہکشاں میرے خیالوں کو لبھاتی ہے، مگر
میری نظروں میں روایات کی زنجیر بھی ہے

مجھ کو فطرت کے صحیفوں پہ یقیں ہے لیکن
میرے ایمان میں انسان کی توقیر بھی ہے

میں جنونی سہی، گستاخ سہی، رند سہی
ذوقِ تخریب میں اک حسرتِ تعمیر بھی ہے

وقت کی بات ہے وقت آئیگا، وقت آئیگا
میرے ہاتھوں میں جو کشکول ہے شمشیر بھی ہے

میں نے توڑے ہیں مہکتی ہوئی سانسوں کے طلسم
میں نے اڑتے ہوئے بالوں کی گھٹا دیکھی ہے

شفق آلود سے ہونٹوں کے حسیں گوشوں میں
میں نے الجھی ہوئی دعوت میں حیا دیکھی ہے

خواب سے چونک کے جب سوئے خرد آیا ہوں
چاک در چاک حکیموں کی قبا دیکھی ہے

ان دھندلکوں سے جو نکلا ہوں تو چاروں جانب
پھڑپھڑاتی ہوئی رسموں کی ردا دیکھی ہے

کس طرف جاؤں کہ ہر ذرے میں، ہر تارے میں
آنکھ دوشیزۂ تقدیر کی وا دیکھی ہے

مجھ کو از بر ہیں محبت کے کئی افسانے
لیکن احساس کے زخموں کو چھپا لوں، تو کہوں

وہ حکایت جو ستاروں نے سنائی مجھ کو
اپنی محفل کے چراغوں کو جلا لوں، تو کہوں

مدعا ذہن میں محفوظ کئے بیٹھا ہوں
سننے والوں کو خماروں سے جگا لوں، تو کہوں

راز معلوم تو ہیں مجھ کو شہنشاہوں کے
ہم صفیروں کے دماغوں میں سما لوں، تو کہوں

شوکتِ گنبد و مینار سے آگاہ ہوں میں
لیکن ایوان کی بنیاد اٹھا لوں، تو کہوں

ذوقِ پرواز بھی ہے حسرتِ پرواز بھی ہے
ساتھ دینا ہے مگر مجھ کو تھکے ہاروں کا

میرے قدموں کو شکنجوں میں جکڑ لیتا ہے
تیز غوغا یہ بھٹکتے ہوئے بازاروں کا

کیسے لپکوں کہ چلا آتا ہے دامن تھامے
ایک انبوہ، سسکتے ہوئے بیماروں کا

برق گامی کے میں قربان۔ ذرا تھم کے چلو
قافلہ رینگتا آتا ہے دل افگاروں کا

ہمسفر چپ ہیں، تم دور اڑے جاتے ہو
یہ رویہ تو مداوا نہیں آزاروں کا

۱۹۴۴ء

شرمیلا فن کار

سیپیاں چنتے ہیں ساحل سے کھلنڈرے بچے
ریت کے نرم گھروندوں میں سجاتے ہیں انہیں
شام جب آتی ہے، سمٹی ہوئی، سنولائی ہوئی
گھر کو بھاگ اٹھتے ہیں، چننے نہیں پاتے ہیں انہیں

ہاں، اگر چاند کے انوار سے رخشاں ہو نہیں
کھیل بچوں کے ذرا طول پکڑ جاتے ہیں
لیکن اک لمحہ بھلا وقت سے کیسے الجھے!
چاند چھپ جاتا ہے، ظلمات امڈ آتے ہیں

دن ڈھلے پھر لب ساحل نظر آتے ہیں ہجوم
سیپیاں چنتے ہوئے، ریت پہ منڈلاتے ہوئے
پھر وہی شام، وہی چاند، وہی تاریکی
پھر وہی سائے سے آفاق پہ لہراتے ہوئے

یہ اگر تیری مشیت ہے، تو خلاکم بدہن
اب تو اس رسم میں پہلو کوئی جدت کا نکال
یا تو روشن ہی رہے، تیرا فلک، میری زمین
یا تری رحمتیں بنتی رہیں ظلمات کے جال

ساحل زیست پہ بکھری ہوئی امید کی ریت
اور دمکتی ہوئی یہ سیپیاں ارمانوں کی
اور پھر موت۔ یہ سنولائی ہوئی شام۔ یہ رات
اور یہ قبریں تیرے محبوبوں کی۔ انسانوں کی

ایک لمحے کے لئے چاند چمکتا ہے اگر — تو یہ اک لمحہ تری دین نہیں ہو سکتا
یہ اس انساں کے یقینوں کی قلابازی ہے — اپنی مرضی سے جو ظلمت میں نہیں کھو سکتا

تیرا مذہب، ترا قانون، ترے رسم و رواج — یہ دلآویز شکنجے ترے مظہر تو نہیں؟
تو اگر حسن ہے، رحمت ہے، کرم ہے یارب — تو ترے ہاتھ میں سونے کا یہ خنجر تو نہیں؟

تیری وحدت تو مسلم ہے، مگر یہ ظلمات — کس نے تخلیق کئے ہیں تری دنیا کے لئے؟
دوسرا کون ہے خلاق پسِ پردۂ چرخ — تو اگر "حال" میں ہے، کون ہے "فردا" کے لئے؟

اصطلاحات کے پردوں سے نکل آ، ورنہ — ابنِ آدم کے لپکتے ہوئے پنجوں سے نہ ڈر
سامنے آ کے نئے نقش بنا۔ رنگ جما
اپنے فن سے کبھی فن کار بھی کرتا ہے حذر!

۱۹۴۴ء

عزم و عمل

فکرِ انجام میں غلطاں ہے شباب
شوقِ عرفاں میں سلگتا ہے سراب

جڑ سے اکھڑیں گے ستاروں کے خیام
اپنی منزل سے گریزاں ہے شباب

جھول بن جائے نہ بے وقت تناؤ
اپنے ہی زور سے ٹوٹے نہ طناب

پھڑپھڑاتا ہے فنا کا دامن
اپنے گنبد میں مچلتا ہے حباب

وقت کی بات ہے، وقت آئے گا
کیوں برسنے کو ترستا ہے سحاب،

ذوقِ پرواز سے انکار نہیں
پہلے احساسِ فضا پیدا کر

جو ستاروں سے الجھ کر نہ رکے
وہ یک آہنگ صدا پیدا کر

اپنی ہستی کو مکمل تو بنا
یعنی تریاقِ قضا پیدا کر

جو نشیبوں میں اترتے ہی نہیں
ان خداؤں کا خدا پیدا کر

جو مشیت کو بھی مسحور رکھے
وہ قیامت کی ادا پیدا کر

عزم کے ساتھ نہ شامل ہو عمل　　تو مقدر کی ہے محکوم، حیات
جو فرشتوں کی گدائی سے ملے　　زہر ہی زہر ہے وہ قند و نبات
جم کے رہ جائے اگر وقت کا سیل　　دہر پہ چھائی رہے رات ہی رات
بے مقامی سے رہا ہے دو چار　　جس نے ڈھونڈا ہے زمانے میں ثبات

یہ خلاؤں کا پُراسرار سکوت
ہے ترے اوجِ خیالی کی زکات

زود رس ہیں ترے افکار، مگر　　یہ غلامی کا بہانہ ہی نہ ہو
یہ خیالات کا تانا بانا　　صرف پریوں کا فسانہ ہی نہ ہو
یہ جو آتی ہے صدا نعروں کی　　تیرے گنبد کا ترانہ ہی نہ ہو
اپنے ماحول کے پردے تو اٹھا　　زیرِ خاشاک خزانہ ہی نہ ہو

راہبانہ ہے ہر انداز ترا
تو مشیت کا نشانہ ہی نہ ہو

۱۹۴۴ء

میری زمین

بلندیوں پہ خیالات کے بسیرے تھے ؎ کہ پستیوں میں خرد آزما اندھیرے تھے
یہاں پہاڑ تھے ظلمات تھے گپھائیں تھیں ؎ وہاں نجوم کے ہنستے ہوئے پھریرے تھے
گمانِ شب سے ملوث نہ تھا وہاں احساس ؎ جدھر نگاہ اٹھی دلربا سویرے تھے

وہاں یقین کی پہنائیاں تھیں لامحدود
یہاں شکوک کی پرچھائیوں کے گھیرے تھے

تصورات سے ہر چند بے قرار رہا ؎ مگر زمین کا احساس استوار رہا
اگرچہ ذہن کی جنت فریب دیتی رہی ؎ مگر نظر میں حقیقت کا مرغزار رہا
توہمات کے بادل نہ چھٹ سکے لیکن ؎ رخِ حبیب اسی طرح تابدار رہا

قدم قدم پہ ملے رنگ و نور کے قریے
ندیم محوِ طوافِ دیارِ یار رہا

اگرچہ نغمۂ گردوں کا ہمصفیر ہوں میں ؎ طلسمِ کاکل و رخسار کا اسیر ہوں میں
مرے جنوں کی اڑانیں ستارہ گیر سہی ؎ ہنوز طالبِ تابانیٔ ضمیر ہوں میں
بنے ہیں چاند کی کرنوں سے پیرہن میں نے ؎ خود اپنے زعم میں باایں ہمہ حقیر ہوں میں

جلال و جمال

مجھے بہشت میں بہلائیں کیوں فرشتہ و حور

کہ خاک و خوں سے اٹھا یا ہوا خمیر ہوں میں

یہ آندھیاں یہ بگولے یہ بجلیوں کے خدنگ
گرج کے ساتھ پہاڑوں کی گونج ہم آہنگ

یہ ایک دختر دہقاں کے عارضوں پہ دھوآں
یہ ایک مردہ سپاہی کا چہرہ گلرنگ

یہ سطح ذہن پہ اخلاقیات کے تودے
یہ آژدہوں کا اک انبوہ زیر پردہ سنگ

ترے کرم سے تو منکر نہیں مرا احساس

الٰہی! مجھ پہ اگر عرصۂ حیات ہے تنگ

خلا میں بھٹکی ہوئی یہ زمین آوارہ
ازل سے جس پہ ہے قربان چاند بے چارہ

دباؤں، زلزلوں، طغیانیوں کا بازیچہ
کہ جس کے شوق میں آدم نے آسماں ہارا

رواں دواں ہی رہا حشر تک تودۂ خاک
ترے کرم جتنے عناصر نے لاکھ سر مارا

بس اب سمیٹ ہی لے چرخ پر بساط نجوم

ندیم خاک کے ذرے میں پا چکا تارا

۱۹۴۴ء

آویزش

(مفکرانہ رُخ)

عروج پر ہے تسلسل کا خواب ناک طلسم
وہی سحر کی اداسی، وہی مذبذب شام
وہی نجوم، وہی دائرے اڑانوں کے
وہی ہلال کے ہاتھوں میں جامِ ماہِ تمام
وہی حیات کی رعنائیوں پہ داغِ اجل
وہی فضا کے دھندلکے، وہی فریبِ دوام
وہی طلائی سیاست، وہی حسیں زنجیر
وہی جلیل شہنشہ، وہی ذلیل غلام
وہی بلند عزائم پہ فلسفے کے پہاڑ
وہی سلیس مذاہب پہ اعتقاد کے دام
میں اپنے ذہن کی انگڑائیاں سمیٹ ہی لوں
بساط اپنے خیالات کی لپیٹ ہی لوں

(شاعرانہ رُخ)

مرے ضمیر میں سیماب وار رقصاں ہیں
وہ ولولے، جو بہلتے نہیں خماروں سے
مرے شعور میں غلطاں ہے بجلیوں کی لپک
جو بے نیاز ہے ماحول کے حصاروں سے
مرے خیال کے سانچے میں ڈھلنے والا ہے
وہ ایک فرد، کہ دبتا نہیں ہزاروں سے

گذر چکی ہے جوانی مرے تصوّر کی
بہاروں اور ستاروں کے نشہ زاروں سے
مرے جنوں کا مجاہد اُلجھنے والا ہے
نظامِ کہنہ کی لچکی ہوئی قطاروں سے
ندیم ذہن کی انگڑائی کیسے ٹوٹے گی
ہر ایک قوس سے جب اک ہوائی چھوٹے گی

۱۹۴۴ء

سہارا

جنونِ خام سہی، آرزوئے منزلِ دوست
فریبِ رنگ سہی، پرتوِ جمالِ حبیب
سراب ایک سہارا تو ہے مسافر کا
سفر دراز سہی، وہ تو ہو رہے ہیں قریب

ایاغِ شب میں ستارے گھلے گھلے نہ سہی
قمر قمر نہ سہی، منجمد جہاں ہی سہی
کسی چمن کے شگوفے تو ہیں نگاہوں میں
وہ ماورائے نظر، وقفِ لامکاں ہی سہی

یہ تیرگی کے ترانے کھلے نشیبوں میں
یہ کوہسار کی چوٹی کا نغمہ بارِ سکوت
یہ معجزات پر اسرار ہی سہی لیکن
انہیں کی دھند میں لرزاں ہیں برق پاش ثبوت

مرا خیال ہے ماضی کی پستیوں سے بلند
مری نگاہ ہے فردا کے چیستانوں پہ
مجھے غریب کی عظمت کو آزمانا ہے
وہ جس کی زد ہے زمینوں پر، آسمانوں پہ

یہ عزم خواب سہی خواب کا وجود تو ہے
غمِ حیات کے دم سے رمِ حیات ملا
وہ اپنی موت کو بھی زندگی بنا لے گا
اگر ندیم کو مرکز حریمِ ذات ملا

۱۹۴۴ء

ستارے

چمک چمک کے تھکے، ٹمٹمائے، گھبرائے
سحر کے نرم اجالوں میں ڈوب ڈوب چلے
چھپے، جھلک سی دکھائی، بجھے، تمام ہوئے
نہ جانے کونسی دنیا میں محوِ خواب رہے
افق کے پاس، کہ اس بیکراں خلا سے پرے
غروبِ مہ کی پرچھائیاں بکھرنے پر
یہ پھر فضاؤں میں اڑنے لگے شرر بن کر
وہی تڑپ، وہی شوخی، وہی درازِ سفر
وہی چمکتے پروں سے طوافِ قرصِ قمر
وہی افق کے دریچوں سے انتظارِ سحر
حیات و موت کے ان دائروں کی زنجیریں
نہ جانے کون سے اسرار کی ہیں تفسیریں
اِدھر دماغ میں ہیں چرخ گیر تدبیریں
ادھر ہیں گھات میں تدبیر سوز تقدیریں
ہیں اک سراب سراپا عمل کی تاثیریں

یہ کھیل ہے، تو کھلاڑی! تری دہائی ہے
اگر یہی ہے خدائی، تو کیا خدائی ہے
یہ کبریائی نہیں ہے، یہ کج ادائی ہے
اگر حیات ترے ہاتھ کی صفائی ہے
تو پھر یہ شب کی دلہن، موت کیوں بنائی ہے

ستارو- ٹوٹ پڑو، بج اٹھو، بکھر جاؤ
بھٹک بھٹک کے جہنم خلا میں بھڑکاؤ
کبھی زحل، کبھی مریخ کی خبر لاؤ
یہاں سے سن سے اڑو، ٹھن سے اس سے ٹکراؤ
فنا کے گیت تباہی کے ساز پر گاؤ!

ازل سے لے کے ابد تک یہی نظام رہا
تو جان لو کہ تڑپنا تمہارا کام رہا
اگر حیات کا افسانہ ناتمام رہا
اگر ہمیشہ انہیں گردشوں سے کام رہا
تو کس کا نام رہا- اور کسے دوام رہا!

۱۹۴۴ء

عرش و فرش

جب راتیں ہن برساتی ہیں احساس کے خلوت زاروں پر
جب حسن کی شبنم گرتی ہے امیدوں کے گلزاروں پر
جب سوچوں کی میزانوں پر رازوں کے موتی تلتے ہیں
ارمانوں کے ویرانوں پر جب عشق کے شہپر کھلتے ہیں
جب فکر کے ناخن چھیڑتے ہیں وجدان کے نازک تاروں کو
دل طاق پہ جب رکھ دیتا ہے ادراک کے استفساروں کو
اس وقت فضا میں کھلتے ہیں غرفے کتنے ایوانوں کے
پریوں کی طرح منڈلاتے ہیں جن میں انبوہ انسانوں کے
زرتار صحیفے ہاتھوں میں، انبار بتوں کے باہوں میں
مسجد کا تجمّل چہرے پر، مندر کا نور نگاہوں میں
ہر شخص کی اپنی دنیا ہے، قانون اپنے، دستور اپنے
ان لاتعداد کلیموں کے ہیں ایمن اپنے، طور اپنے

ان ایوانوں کے غرفوں تک جب ذہن رسائی پاتا ہے
ناگاہ زمیں سے اک سایہ تیزی سے ابھر کر آتا ہے
آنکھوں میں ستاروں کا بچپن، عارض پہ جوانی پھولوں کی
ماتھے پر سیندوری ٹیکا، لب پر تقدیس رسولوں کی
اس شدت سے جتلاتا ہے یزداں پہ حقوق انسانوں کے
تھراتے ہوئے کھل جاتے ہیں تاروں میں نقوش ایوانوں کے

۱۹۴۵ء

احساس و ادراک

یہ گھنا جنگل، یہ خاموشی کی پر اسرار لَے — اس اندھیرے میں یہ پوشیدہ مغنّی کون ہے؟

جو سکوت افزا ترنم سے کیا کرتا ہے طے —

ہر دیارِ کائنات

اس کے آہنگِ مسلسل میں فرشتوں کی اڑان — اس کے سرگم میں نہاں دستِ مشیت کی اٹھان

روح میں یوں پیچ و خم کھاتی ہے اس کافری تان —

جیسے اسرارِ حیات

سانس ہے اس کی، کہ بہتی ہے شرابِ لالہ فام — اس کی کروٹ ہے کہ لرزاں ہے دو عالم کا نظام

لمس ہے اس کا، کہ خود یزداں ہے مصروفِ کلام —

در بیانِ ممکنات

آگہی کہتی ہے — اس راہ سرورآگیں پہ چل — شوق کہتا ہے — خیابانوں کے زنداں سے نکل

حکمِ شاہی ہے کہ اک نقطے پہ جم جا سر کے بل —

کھو کے امکانِ حیات

لیکن اک آواز — خاموشی سے جو موسوم ہے (جس کا منبع یا تو خود قدرت ہے یا معدوم ہے)
"تو اگر انساں ہے، ہر کرّہ ترا محکوم ہے —
اے قتیلِ حادثات"
یک بیک ہیجان سا آتا ہے ہفت افلاک میں کلبلاتے ہیں کئی مرّیخ بطنِ خاک میں
دہر گھر جاتا ہے اس ناقوس کے پیچاک میں —
آگہی کھاتی ہے مات

۱۹۴۵ء

احیاء

جل چکا باغِ ارم، یادِ ارم باقی ہے
ابھی وجدان میں تخلیق کا دم باقی ہے

گھل گئے پھول امڈتی ہوئی ظلمت میں مگر
تیز خوشبو سے گلستاں کا بھرم باقی ہے

کنج کے سامنے، انگڑائی سی لیتا ہوا پیڑ
کھو چکا ہے، مگر اک نرم سا خم باقی ہے

موج مدہوش سہی، موت نہیں مدہوشی
یہ بتانے کو حبابِ لبِ یم باقی ہے

نصف شب تک نہیں محدود تماشائے جمال
ٹوٹتی رات کے تاروں کا جنم باقی ہے

شمع خاموش سہی، نور سے عاری تو نہیں
آہو محبوس سہی، شیوۂ رم باقی ہے

بت تراش اپنی عبادت میں مگن ہیں، جبتک
تو وہ سنگ و تقاضائے صنم باقی ہے

ذوقِ تجدید ہو جس دل میں وہ نومید نہیں
رات کیا آمدِ خورشید کی تمہید نہیں

۱۹۴۶ء

ازلی استفہام

جب کبھی موسمِ گل عطر فشاں ہوتا ہے
مجھ کو دنیا یہ جہنم کا گماں ہوتا ہے

نئی تعمیر کے گنبد پہ بصد ناز و غرور
دیوِ تخریب بہ ہر سو نگراں ہوتا ہے

زرد لاشوں کے پرے ذہن پہ منڈلاتے ہیں
جب کہیں ذکرِ مسیحا نفساں ہوتا ہے

ہر چکا چوند میں غلطاں ہیں اندھیری آہیں
خال کیوں زینتِ رخسارِ بتاں ہوتا ہے

جس کی تخلیق ہو دراصل عناصر کا فریب
وہ کرم باعثِ آشوبِ جہاں ہوتا ہے

جب نہ لہجے میں مروّت ہو نہ وعدوں میں خلوص
تجربہ ہے کہ جبھی حسن جواں ہوتا ہے

زلف و رُخ سے جو نہ بہلا، وہ پراگندہ شباب
نکہت و رنگ سے سرشار کہاں ہوتا ہے

ابدیّت بھی تو یا رب ترے بس میں ہو گی
آخر اس دین سے کیا تیرا زیاں ہوتا ہے

۱۹۴۶ء

پرواز کے بعد

دھواں دھواں ہے آسمان، الاماں!
ٹھٹک گیا ہے زندگی کا کارواں
بھٹک گئے ہیں قصرِ شب کے پاسباں
نگاہ گھومتی رہی، کہاں کہاں
نہ ماہتاب کا نشاں، نہ کہکشاں!

بس اب ہیں ذوق پر بلندیاں گراں
بس اب اتر چلیں گے زیرِ آسماں
مگر مرے خیال! اے میرے راہ رواں
مجھے نہ راس آسکیں گی پستیاں
وہ بستیاں جو اب نظر سے ہیں نہاں

یہ کون لے چلا مجھے کشاں کشاں

وہ ایک گیند سی ہے کیا شرر فشاں!
سنہری گرد چھا گئی جہاں تہاں
چھلک رہی ہیں چاندنی کی پیالیاں
یہ خلد ہی نہ ہو خلا کے درمیاں

نہیں نہیں، نہ رک سکیں گے ہم یہاں
تجلیوں کی چشمکیں ہیں بے اماں
یہ کون ہو گئے ہمارے ہم عناں
ستارے، چاند، آفتاب، بجلیاں!
مچلتے ناچتے ہوئے، یہاں وہاں!

زمین۔ اے زمین! اے مرے جہاں!
میں بہ گیا، بہک گیا فغاں فغاں!
میں خود کہاں، مرا وجود ہے کہاں!
یہ کس کے نور کا ہے سیلِ بے کراں!
رواں دواں۔ رواں دواں۔ رواں دواں

جلال و جمال

مجھے قبول ہیں زمیں کی پستیاں
مگر زمین و آسماں کے درمیاں
یہ ایک ذرۂ حقیر و ناتواں
رہے گا کب تک آخر اس طرح تپاں
رواں دواں۔ رواں دواں۔ رواں دواں

۱۹۴۶ء

مستقیم و منحنی

راہِ پُر پیچ سے کترا کے نکلنے والو
شاہراہوں کی کراہیں بھی سنی ہیں میں نے
تپشِ شدتِ احساس کے دوزخ کی قسم
دامنِ برق سے کلیاں بھی چنی ہیں میں نے
جن کی حدت سے اتر جاتا ہے ملبوسِ حریر
ان شعاعوں سے نقابیں بھی بنی ہیں میں نے

سب امڈتے ہوئے بادل نہیں برسا کرتے
سب دمکتے ہوئے ذرّات نہیں زرپارے
ہر چمکتی ہوئی بجلی نہیں ٹوٹا کرتی
اپنے ہی نور سے رخشاں نہیں تارے سارے
کتنی تاریک نگاہی ہے کہ پورب والے
"آدمی" ہیں مگر انسان نہیں بے چارے

راستہ راست سہی، راہنما ساتھ سہی
لیکن اس راہ پہ منزل بھی تو آئے کوئی
امن انعام سہی، خرخشے بدنام سہی
لیکن اس امن سے تسکیں بھی تو پائے کوئی
اجنبی راہوں پہ ابھرے وہ طلائی گنبد
میری آنکھوں سے اب آنکھیں تو ملائے کوئی

۱۹۴۶ء

تسنیم[1] کے نام

میں نے راتوں کو اجالوں کی دعائیں مانگیں
اور مقدر سے گھٹا ٹوپ اندھیرے پائے

جھونکے چاہے، تو غضبناک بگولے اُٹھے
پھول مانگے تو جہنم کے تھپیڑے پائے

میرے وجدان نے جو راہ دکھائی تھی مجھے
اس کے ہر خم پہ تمدن کے لٹیرے پائے

گھیر رکھا تھا جنہیں سرو و سمن نے ہر سُو
ان کچھاروں میں پلنگوں کے بسیرے پائے

جھٹپٹے ہی میں کٹیں زیست کی تپتی گھڑیاں
نہ ستارے ہی ملے، اور نہ سویرے پائے

عشق کے سیکڑوں گلزار سجائے میں نے
اِن میں کوئی پئے گلگشت مگر آ نہ سکا

ذہن نے حکمت و منطق کی پناہیں ڈھونڈیں
لیکن اِس طفل کو یہ کھیل بھی بہلا نہ سکا

شاعری کی، مگر ادراک کی الجھن نہ مٹی
ساز اٹھایا، مگر اعجاز کا گُر پا نہ سکا

کیا کہوں، کتنی گھٹاؤں کے نچوڑے دامن
کشتِ احساس پہ اک بُوند بھی ٹپکا نہ سکا

میں وہ تلوار ہوں جو رقص کی پیاسی ہی رہی
میں وہ پرچم ہوں جو طوفاں میں بھی لہرا نہ سکا

ربطِ باہم کے زمانے سے تقاضے تو ہوئے
میرے جذبات کا معیار مگر عام نہ تھا

[1] تسنیم سلیم چھتاری

رنگ و روغن کے سراب آئے مری راہوں میں
شوقِ سجدہ مرا شرمندۂ اصنام نہ تھا

مئے گلفام کی ترکیب تھی میرا مقصود
میری نظروں میں فقط کیف نہ تھا، جام نہ تھا

کونسی روح تھی جو لرزہ بر اندام نہ تھی
کونسا قلب تھا جو کشتۂ آلام نہ تھا

قہقہوں میں اگر آنسو نظر آئے مجھکو
تو مرا ذوقِ نظر موردِ الزام نہ تھا

اتفاقات سے ہنگامۂ عالم کا وجود
اتفاقات کی مرہون تب وتابِ حیات

اتفاقات کی قوت ہے قیامت کی حریف
اتفاقات کی تخلیق ہیں یزداں کے صفات

اتفاقات کا محکوم مرورِ ایام
اتفاقات کا محتاج تغیر کا ثبات

اتفاقات کی بے مثل مسیحائی نے
میرے وجدان کو دی تلخ تذبذب سے نجات

یہی اک لفظ مری زیست کا عنوان بنا
منتظر تھی اسی مہتاب کی، ادراک کی رات

ایک ننھی سی طلب! — ایک ذرا سی تلخی!
خود مری روح نے آخر مجھے پہچان لیا

"تم کہاں تھے مرے بچھڑے ہوئے بھولے بھیا؟"
"اے بہن! میں نے تجھے جان لیا، مان لیا"

تیرے احساس سے اک ولولۂ نَو پایا،
تیرے ادراک سے اک عزم کا طوفان لیا

تیرے احسان سے عرفان کی دولت پائی
تیرے پیمان سے ایمان کا سامان لیا

جس کی لَو سے مری ہستی تھی جہنم بکنار
تیرے دربار سے اس درد کا درمان لیا

کس قدر دُور تھے ہم! کتنے قریب آپہنچے
یہ سفر مجھ کو فراموش نہ ہوگا زنہار

جلال و جمال

میری خواہر، تری پاکیزہ محبت پاکر
نکھر آیا ہے مرے ذوقِ نظر کا معیار

خود شناسی کے کھلے بن ہیں مری نظروں میں
اب گرفتارِ تفکر، نہ تدبر بیمار

اب تو گریہ بھی ہے آسودہ، تبسم بھی غنی
اب تو ہے میرے لئے خار بھی گلشن بکنار

اب تو ہر سانس ترے دم سے ہے موجِ تسنیم
اب دلاسوں کی طلب ہے، نہ سہارے درکار

زندگی اب مری نظروں میں ہے اک سعیِ مدام
اک لچک، ایک جھپٹ، ایک لپک، ایک خروش

جن کی تہذیب کی معراج ہے مشرق کا زوال
اب کہاں جائیں گے مغرب کے وہ انسان فروش

جوش میں آئیں گے ماحول کے دیرینہ شکار
ہوش میں آئیں گے مذہب کے پرانے مے نوش

مجھ کو قوت کی چکا چوند دکھاتی ہے انہیں
روزِ روشن میں رہے جن کے گھروندے شب پوش

میں مشیت کا اشارہ، میں عناصر کا جلال!
کبھی بپھرے ہوئے سیلاب بھی رہتے ہیں خموش!

اب مری راہ میں حائل ہیں نہ گرد اب نہ خواب
اب بہت دور ــــ بہت دور مجھے جانا ہے

ایک بھرپور محبت ہے نگہباں میری
اب محبت کے ہر احساس کو چونکانا ہے

مرتکز ہیں اسی نقطہ پہ مری امیدیں
اب ہر انسان کو مرکز کی طرف لانا ہے

اعتماد ــــ اور رسائی کا مکمل ایمان
اب شکستوں پہ نہ رونا ہے نہ پچھتانا ہے

میری خواہر! مری ہمشیر! مری روحِ رواں
تجھ کو پہچان کے کونین کو پہچانا ہے

۱۹۴۶ء

تضحیک

کائنات ایک پہیلی کا دھندلکا بن کر ۔۔۔ میرے آئینۂ ادراک پہ چھا جاتی ہے
پھیل جاتے ہیں کچھ اس طرح تصور کے خطوط ۔۔۔ زندگی آنکھ اٹھاتے ہوئے گھبراتی ہے

عشق، احساس، جوانی، غمِ دنیا، غمِ دیں ۔۔۔ ایک دل اور یہ افکار کی گھنگھور گھٹا
سٹپٹاتا ہوں، لپکتا ہوں، ٹھٹک جاتا ہوں ۔۔۔ چار جانب سے یہ آتی ہے صدا — کیا ہوگا!

جو بھی ہوگا مجھے منظور ہے — جی لینے دو ۔۔۔ وسوسو، آرزوؤ، کشمکشو، ارمانو!
تم عبارت ہو مری زیست سے تسلیم، مگر ۔۔۔ جو مرے ذہن پہ بیتی ہے وہ تم کیا جانو

چاند کے ساتھ ستارا تو ہے، لیکن کیوں ہے؟ ۔۔۔ تتلیاں پھول پہ کیوں آتی ہیں، کیا پاتی ہیں؟
پھول کے رنگ میں خوشبو کا رچاؤ کیا ہے؟ ۔۔۔ روحیں قالب سے نکلتے ہی کہاں جاتی ہیں؟

آسماں حدِ نظر ہے، تو زمیں کیا شے ہے؟ ۔۔۔ یہ بھی اعجازِ نظر ہے تو خدا کیا ہوگا!

جلال و جمال

وہ بھی تخئیل کی جنّت ہے تو حُنا کم بدہن
عاقبت کیا ہے؟ وہاں جلوہ نما کیسا ہوگا!

گہری کہروں سے ہے معمور خیالوں کی خلا
دھندلی راہیں ہیں، سمٹتی ہوئی، چکراتی ہوئی
ایسے موڑ آتے ہیں جب روح لرز اٹھتی ہے
لڑکھڑاتے ہی اچٹ جاتی ہے نیند آتی ہوئی

آنکھ کھلتے ہی اُمڈ آتی ہے گھنگھور گھٹا
عشق، احساس، جوانی، غمِ دنیا، غمِ دیں
یوں بکھر جاتے ہیں ماحول و مقدر کے نقیب
جیسے فطرت کا کھلونا ہوں میں انسان نہیں،

۱۹۴۶ء

دائرہ

شبنم کے زمرّدیں ستارے
سبزے کی ردا پہ جم گئے ہیں
برّاق، سماق رنگ بادل
مبہوت خلا میں تھم گئے ہیں

پربت کی سفید رفعتوں پر
پورب نے شفق نچوڑ ڈالی
زرکار سبک افق کہاں ہے
تیروں نے کمان توڑ ڈالی!

پھولوں میں بھی رقص رچ گیا ہے
پتّوں میں بھی رم سما گیا ہے
کروٹ ہے، تڑپ ہے، بے کلی ہے
سیلابِ حیات آگیا ہے

جلال و جمال

مرکز سے لپٹ کے سائے رینگے
پورب سے شفق کی بھیک لینے
اس درجہ بڑھا جمالِ خورشید
ہر پھول جھکا خراج دینے

پچھم میں پگھل رہا ہے سونا
سونے میں لہو کی دھار دوڑی
وہ ایک حسینۂ سیہ پوش
آشفتہ و بے قرار دوڑی

دھرتی پہ گرے گی نیند بن کر
رینگے گی امید کے سہارے
سنبھلے گی تو مسکرا اٹھیں گے
شبنم کے زمرّدیں ستارے

۱۹۴۶ء

فن

ایک رقاصہ تھی ــــ کس کس سے اشارے کرتی
آنکھیں پتھرائیں، اداؤں میں توازن نہ رہا
ڈگمگائی، تو سب اطراف سے آواز آئی ــ
"فن کے اس اوج پہ اک تیرے سوا کون گیا!"
فرشِ مرمر پہ گری، گر کے اٹھی، اٹھ کے جھکی
خشک ہونٹوں پہ زباں پھیر کے پانی مانگا،
اوک اٹھائی تو تماشائی سنبھل کر بولے ــ
"رقص کا یہ بھی اک انداز ہے ــــ اللہ! اللہ!"
ہاتھ پھیلے رہے، سِل سی گئی ہونٹوں سے زباں ــ
ایک رقاص کسی سمت سے ناگاہ بڑھا،
پردہ سرکا، تو معاً فن کے پجاری گرجے ــ
"رقص کیوں ختم ہوا؟ وقت ابھی باقی تھا!"

۱۹۴۶ء

تفاوت

۱۹۱۸ء

آسماں پر ہیں رقصاں ستارے وہی
نقرئی چاندنی کے ہیں دھارے وہی
پربتوں پرندی کے طرارے وہی
ریگزاروں ہیں رخشاں شرارے وہی

ساری دنیا وہی سب نظارے وہی

آدمیت بدستور مجبور ہے
اور مشیت بدستور مغرور ہے
جینا مرنا ہی دیرینہ دستور ہے
زندگی ان سوالات سے چور ہے
تشنگی ہی ابھی جن کا مقدور ہے

رائی کی کوہ پر برتری بھی وہی
بادہ سازوں کی تشنہ لبی بھی وہی

خانقاہوں کی یزداں گری بھی وہی
خواجگی بھی وہی — بندگی بھی وہی
آدمی کو "غمِ آدمی" بھی وہی
زندگی کے پرانے تقاضے وہی
سارے چہرے وہی، سارے غازے وہی

۱۹۴۶ء

آسماں پر نمایاں نئے رنگ ہیں
تارے گلرنگ ہیں (آدمی دنگ ہیں)
ان کی پروازیں کتنی ہم آہنگ ہیں
ایک آواز ہے ان گنت چنگ ہیں
ایک تصویر ہے، لاکھ ارژنگ ہیں

ایک ذرہ جہنم بدوش! الاماں
ایک بندہ خدائی فروش! الاماں
زندگی کا یہ جوش و خروش! الاماں
آسماں پر شیت خموش! الاماں
اور قدرت پراگندہ ہوش! الاماں

برتری کا تصور ہوا ہو گیا،
آدمیت کا مقصد ادا ہو گیا
آدمی، آدمی آشنا ہو گیا
آدمی، آدمی پر فدا ہو گیا
آدمی کبریا آزما ہو گیا

نوعِ انساں نے اب روپ دھارے نئے
ساری دنیا نئی سب نظارے نئے

۱۹۴۶ء

ذرّے

تجھے بہشت میں بھی مل سکا نہ اطمینان
میں دشتِ نجد کی ویرانیوں میں بھی خورسند

●

سمجھ میں آ نہ سکی آج تک حقیقتِ حال
ہے آئینہ مرے ادراک کا غبار آلود

●

مرے جہاں میں وہ اہلِ نظر بھی بستے ہیں
جو دیکھتے ہیں رگِ سنگ میں بھی تارِ حریر
ہیں زندہ آج بھی وہ بندگانِ استغنا،
جو اپنی روح سے لیتے ہیں کارِ بدرِ منیر

●

اک طرف اشکوں کی جھڑیاں، اک طرف شہنائیاں
کتنی بے ہنگم ہیں قدرت کی کرشمہ زائیاں

●

جھکوں تو کون و مکاں کو بھی سرنگوں کر لوں
اڑوں تو جا کے کروں عرش پر ستارے شکار

مجھے تو وقت کی نیرنگیاں نہیں بھاتیں
مجھے زمان و مکاں کے تغیرات دکھا

•

مجھ کو ماحول کی ظلمت سے سروکار نہیں
کیا ستارے مرے احساس کے بیدار نہیں!

•

نورِ ابدیت کو سرِ طور نہ دیکھو
جو دل میں ہے مستور اسے دور نہ دیکھو

•

اے ستاروں کے جھروکوں سے بلانے والے
منزلیں دور ہیں، معذور ہیں جانے والے

•

کون بتلائے، ہیں کس طرفہ قیامت کے نقیب
خنجر ابھرے ہوئے تاریخ کے عنوانوں میں

•

حقیقت میں مشیت نے فقط اک کھیل کھیلا ہے
وگرنہ زندگی اک محشرِ اوہام ہے ساقی!

پتلے پتلے آبگینے ہیں یہ روز و شب ندیم
آئینہ خانے میں جو آئے گا حیراں جائیگا

•

زخمے کی چوٹ نے اسے نغمے سکھا دیئے
یوں ورنہ کوئی بات نہیں تھی رباب میں

•

شام تمہید ہے اس مصحفِ نورانی کی
جس کا عنوان ہے خورشید کا بڑھتا ہوا نور
یہ اندھیرے تو اجالوں ہی کے رکھوالے ہیں
کہ ہے آویزشِ اضداد میں جینے کا سرور

(۲)

خوش میدہد نشانِ جلال و جمالِ یار
خوش میکند حکایتِ عزّ و وقارِ دوست

حافظؒ

یہ شعر

یہ شعر راز ہیں ان برق گام گھڑیوں کے
جھلک رہی ہے تری پتلیوں میں جن کی یاد

یہ شعر راز ہیں ان تابناک راتوں کے
لبوں تک آ کے ترستی تھی جب مری فریاد

یہ شعر راز ہیں ان رس بھرے فریبوں کے
ہوا ہے جن سے مری زیست کا چمن برباد

یہ شعر راز ہیں اس سرپھری جوانی کے
ہمیشہ جس کو رہی آرزوئے ابر و باد

یہ شعر اس فلکِ بیکراں کے تارے ہیں
تصوراتِ جواں نے جسے کیا ایجاد

یہ شعر میرے لہو کے وہ گرم قطرے ہیں
تپش سے جن کی، دہکنے لگی کفِ صیّاد

یہ شعر عہدِ محبت کی ہیں وہ تاریخیں
جھکی بھووں میں سمائی ہوئی ہے جن کی یاد

یہ شعر میرے ارادوں کے چند خاکے ہیں
کبھی مٹا نہ سکا جن کو دستِ استبداد

یہ شعر میری محبت کی داستانیں ہیں
یہ میرے ماضیِ مرحوم کی زبانیں ہیں

۱۹۳۷ء

ایک خط کے جواب میں

[استفسار تھا کہ :- "میرے خیال میں "تصور" محض شاعری ہے، لیکن اگر میرا خیال غلط ہے، تو مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ تصور کی نوعیت کیا ہے ؟"]

کبھی دیکھا ہے تم نے نصف شب کو
دریدہ بادلوں میں اک ستارا؟
یونہی ماضی کی گہری ظلمتوں میں
تصور جھلملاتا ہے تمہارا

۱۹۳۵ء

یادِ رفتہ

پھر وہی محشر صفت گھڑیاں مجھے یاد آ گئیں
ساون آیا ہے کہ دل پر بدلیاں سی چھا گئیں
بوندیاں چنگاریاں سی روح میں دوڑا گئیں

وہ جوانی، وہ جنوں کی رُت، وہ ارمانوں کا دَور
مشتعل جذبات کے محبوب طوفانوں کا دَور
میری تعمیلوں کا موسم، تیرے فرمانوں کا دَور

جب کھجوروں کے تلے ویران نخلستاں کے پاس
راہ تکتے تکتے ہو جاتی تھیں امیدیں اداس
یک بیک جب سرسراتا تھا ترا رنگیں لباس

جب فلک پر تیرتے تھے ابر پاروں کے ہجوم
جھانکتے تھے ابر پاروں سے ستاروں کے ہجوم
تیری آنکھوں میں جھپکتے تھے اشاروں کے ہجوم

جلال و جمال

دل میں جب جوشِ جوانی ولولہ انگیز تھا
جب اُمنگوں کا جنوں نس نس میں طوفاں خیز تھا
جب رگوں میں خوں نہ تھا، اک سیلِ آتش ریز تھا

چاندنی سے لبریز جھرنوں میں اُتر جاتے تھے ہم
دل ہی دل میں مرمریں لہروں سے گھبراتے تھے ہم
دیکھ کر اک دوسرے کو جھینپ سے جاتے تھے ہم

جھانکتا تھا نیم کی شاخوں سے ہم کو ماہتاب
مرمریں پوروں سے جب تو چھیڑ دیتی تھی رباب
زندگی لہرا کے بن جاتی تھی اک صد رنگ خواب

وہ تری آنکھوں میں نیندوں کا گلابی سلسلہ
وہ ترے بالوں میں اک اُودا سا پھول اُلجھا ہوا
وہ ترے ہونٹوں کے گوشوں میں تقاضا لمس کا

دلربا خوابوں کی دنیا میں چلے جاتے تھے ہم
گونجتی خاموشیوں سے دل کو بہلاتے تھے ہم
پَو پھٹے چپکے سے گاؤں کو پلٹ آتے تھے ہم

آج تو پردیس میں کیا جانے کس عالم میں ہے
دُور ہے، لیکن مری ہر سانس میں، ہر دم میں ہے
میرے قلبِ ملتہب میں، میری چشمِ نم میں ہے

۱۹۳۶ء

امید

خوابوں پہ مرے منڈلاتا ہوا اور کون و مکاں پر چھاتا ہوا
یہ کون لپکتا آتا ہے کرنوں کے علم لہراتا ہوا
آنکھوں میں نیند سی چھائی ہوئی، ہونٹوں پہ ہنسی سی آئی ہوئی
بالوں کی مچلتی ظلمت سے عالم پہ نشے برساتا ہوا
وہ قوس قزح میں لپٹا ہوا اور ڈوبا ہوا خوشبوؤں میں
گاتا ہوا دھیما سا نغمہ اور گاتے ہوئے بل کھاتا ہوا
مہتاب کو بوسہ دیتا ہوا تاروں کو جلو میں لیتا ہوا
تقدیر کے بجھتے دیپک پر امید کی لو بھڑکاتا ہوا
موہوم افق پر ایک کھلی شہراہ بنا کر تیر گیا
ناکام محبت کے دل میں ہمت کا لہو دوڑاتا ہوا

۱۹۳۷ء

دعوت

آؤ، ہم تم لہلہاتے سبزہ زاروں میں رہیں
ان افق تک کانپنے والی بہاروں میں رہیں

زندگی کی پستیوں سے بے خبر ہو جائیں ہم
نیلے نیلے، اونچے اونچے کوہساروں میں رہیں

اس تصنع آفریں قصرِ حسیں کو چھوڑ کر
دور تک پھیلے ہوئے سادہ نظاروں میں رہیں

جب گھٹائیں جھوم کر چومیں جبینِ کوہسار
نرم رو جھونکوں میں جھولیں، ابرپاروں میں رہیں

جب سحر سرکائے پیشانی سے مٹیالا نقاب
گھومتے پھرتے شفق کے نشہ زاروں میں رہیں

رات کی چپ چاپ وادی سے چنیں نیندوں کے پھول
حشر تک خوابوں کے ان فردوس زاروں میں رہیں

ہائے یہ ساون۔ یہ گاتی ندیوں کے پیچ و خم
بجرے پھولوں کے بنائیں، جوئباروں میں رہیں

ان میں بھی جب روح اکتائے تو اے جانِ ندیم
اڑ چلیں اور آسمانوں کے ستاروں میں رہیں

۱۹۳۷ء

ایک تصوّر

اک دل نشیں تصوّر آنکھوں پہ چھا رہا ہے
اک رنگ آ رہا ہے، اک رنگ جا رہا ہے

وہ، دور بادلوں کے ایوانِ مرمریں میں
اک ساقیِ دل آرا ساغر لنڈھا رہا ہے

دھندلے افق کے اوپر وہ صبح کا ستارا
اب جھلملا رہا ہے، اب ٹمٹما رہا ہے

کھیتوں کی وسعتوں پر سویا ہوا دھندلکا
اب دم بخود پڑا ہے، اب سرسرا رہا ہے

وادی کے اک اندھیرے گوشے میں کوئی پنچھی
خوابیدہ ظلمتوں کا شانہ ہلا رہا ہے

جھرنے تھرک رہے ہیں، طاؤس ناچ رہے ہیں
موسیقیوں کا ساحر کچھ گنگنا رہا ہے

پگڈنڈی کے کنارے جھاڑی میں ایک ٹڈّا
دریائے خامشی میں چھینٹے اڑا رہا ہے

ابھرا وہ ہولے ہولے اک مرمریں ہیولے
اب پاس آ رہا ہے اب دور جا رہا ہے

رنگین عارضوں پر کلیاں چٹک رہی ہیں
زلفوں کی ظلمتوں سے بادل بنا رہا ہے

رخ سے الٹ کے پردہ جھپکا رہا ہے آنکھیں
شمعیں جلا رہا ہے شمعیں بجھا رہا ہے

یوں رقص کر رہا ہے بدمست ناگ جیسے
لہراتا، سرسراتا، بل کھاتا جا رہا ہے

یوں مسکرا رہا ہے، جیسے مہِ منوّر
بادل کے طاقچے میں مشعل جلا رہا ہے

یوں سانس لے رہا ہے میرے قریب تھم کر　　جیسے سمندروں میں طوفان آ رہا ہے
یوں کھیلتا ہے میری پژمردہ انگلیوں سے　　جیسے کوئی شکستہ بربط بجا رہا ہے

بے چین پتلیوں کی گہرائیوں میں مجھکو
بیتے ہوئے دنوں کا ناٹک دکھا رہا ہے

داماںِ شب حریمِ مشرق میں پھڑپھڑایا　　اور تار تار ہو کر وہ اُڑتا جا رہا ہے
وہ پَو پھٹی۔ وہ سورج پورب کے پربتوں پر　　اک آگ اور لہو کا دریا بہا رہا ہے
ناگاہ پتلی پتلی کرنوں کے تیر چھوٹے　　آنکھیں جھپک رہی ہیں دل تلملا رہا ہے

میں وقت کے پروں کو اے کاش کاٹ سکتا
یا ظلمتوں کا افعی کرنوں کو چاٹ سکتا

۱۹۳۷ء

جوگی کا گیت

مغربی افق کے پار، پیلے پیلے تاروں میں، چاند مسکراتا ہے
جھیل کے کنارے پر اک چراغ کٹیا کے پاس ٹمٹماتا ہے
سوئی سوئی لہروں پر چاندنی کی بارش سے تھرتھری سی طاری ہے
یا کسی حسینہ کا — قہقہوں کی کرنوں میں — ہار جگمگاتا ہے
ٹوٹی پھوٹی کٹیا میں، اک اداس سا دوہا - گا رہا ہے اک جوگی
عشق آسمانوں پر، پردۂ ازل تھامے حسن کو بلاتا ہے
ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے ہیں بھینی بھینی خوشبو ہے، نرم نرم لہریں ہیں
جانے کیسی یاد آئی، کچھ تو یاد پڑتا ہے، کچھ تو یاد آتا ہے
وہ کسی کی آنکھوں کا، اذن دید دیتے ہی، یک بیک جھپک جانا
جیسے چاند بدلی کی آڑ سے نکلتا ہے اور ڈوب جاتا ہے
اُف یہ دلنشیں نغمہ، ہائے یہ حسیں نغمہ، وائے یہ حزیں نغمہ
میرے سرد ماضی پر، تیر بن کے آتا ہے، تیر تیر جاتا ہے

ہانپتے نظاروں میں میرا جانا پہچانا ایک ہاتھ لہرایا

کانپتے ستاروں میں ایک مرمریں پیکر اوڑھنی اڑاتا ہے

اونگھتی چراگاہیں دردناک تانوں سے کروٹیں بدلتی ہیں

اجلی صبح کا دامن مشرقی پہاڑوں کے پاس پھڑپھڑاتا ہے

عنقریب مغرب کے کالے کالے غاروں میں چاند ڈوب جائیگا

تیرا گیت، اے جوگی۔ مجھ کو یاد آتا ہے — مجھ کو یاد آئے گا

۱۹۳۷ء

محبوب مجھے اک گیت سُنا

محبوب! مجھے اک گیت سنا
ہلکا پھلکا، میٹھا میٹھا
پہلے ابھرے اٹھلاتا ہُوا
اک دائرے میں چکراتا ہُوا
پھر ہولے ہولے اڑنے لگے
کرنوں کے سہارے مڑنے لگے
تاروں سے کترا کر نکلے
افلاک سے لہرا کر نکلے
لہراتا رہے، لہراتا رہے
خوابوں کے نشے برساتا رہے
پلٹے، مہتاب سے ٹکرائے
تیورا کے زمیں پر لوٹ آئے
یکلخت مچل کر چڑھ جائے
سدرہ سے بھی آگے بڑھ جائے

اک لہر سی بن کر بہ جائے
اک گونج سی باقی رہ جائے

۱۹۳۸ء

بھولی بسری باتیں

ہوا کی مغموم راگنی میں نہاں ہیں وہ بھولی بسری باتیں
کہ جن کی یادوں سے گونجتی ہیں جدائیوں کی اندھیری راتیں
گلوں کے محزون تبسموں میں وہ ساعتیں خون رو رہی ہیں
کہ جن کے پرتو سے میری تیرہ نصیبیاں مست ہو رہی ہیں
فضا کی موہوم گنگناہٹ میں تیرتی ہیں وہ داستانیں
جنہیں بیاں کرتے وقت آنکھوں میں آ گئی تھیں کئی زبانیں
پہاڑ کے نیلگوں دھندلکوں میں وہ نشے تھر تھرا رہے ہیں
جو آج بھی دل کی دھڑکنوں میں خمار بن کے سما رہے ہیں
یہ جنگلوں کا سکوت، یہ چاندنی، یہ جھرنوں کا صاف پانی
سنائی دیتی ہے مجھ کو ہر چیز میں وہی دلربا کہانی
وہ ڈوبتا چاند جو افق پر گھٹا سے دامن بچا رہا ہے
وہی کہانی - وہی کہانی - وہی کہانی سنا رہا ہے
جسے کبھی کہکشاں کے سائے میں سنتے سنتے گذاریں راتیں
وہ راتیں جن میں رچی ہوئی ہیں لطیف گھاتیں، عمیق باتیں

۱۹۳۸ء

رخصت

اف یہ بھیگی ہوئی پلکیں، یہ لرزتے ہوئے ہونٹ

آئینہ رنگ جبیں پر یہ پسینے کے شرار — سانس میں لپٹی ہوئی روح کی دلدوز پکار

مست آنکھوں سے چھلکتے ہوئے غمناک خمار — زرد باہوں میں یہ کل رات کے مسلے ہوئے ہار

چیخ سی شدتِ غم سے ہوئی انجن سے بلند — چھا گیا آنکھ جھپکتے ہی فضاؤں پہ غبار

گونج پہیوں کی بھی اب دور کہیں ڈوب گئی

قلب میں ان کا تصور ہے لہو بن کے رواں — ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں ہیں خلا میں غلطاں

تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں میں ہے وحشت سی نہاں — پھڑپھڑاتے ہوئے آنچل میں ہیں پنہاں طوفاں

اف یہ لپٹا ہوا الجھے ہوئے بالوں میں وجود — نیلے آکاش پہ ہے عکس یہ کس کا رقصاں

اف یہ بھیگی ہوئی پلکیں، یہ لرزتے ہوئے ہونٹ

۱۹۳۹ء

سپاہی کی واپسی

وہ نیلے نیلے آسماں پہ ننھی ننھی بدلیوں کے قافلے
وہ اونچی اونچی چوٹیوں پہ جنگلوں کے سلسلے ہرے بھرے
وہ سبز سبز کھیتیاں، وہ اونچے نیچے راستوں کی کروٹیں
وہ سوئی سوئی جھیل پر شعاعِ خور کی تابناک لرزشیں
وہ بکریوں کی اک قطار جا رہی ہے گھاٹیوں کی چھاؤں میں
وہ ڈھول کی صدا سنائی دے رہی ہے ۔۔۔ دور ۔۔۔ ایک گاؤں میں
افق پہ اک مہین سا دھندلکا خیمہ زن ہے، جانے کس لئے
جبینِ کائنات کی جبیں پہ یہ شکن ہے، جانے کس لئے
میں واپس آرہا ہوں آج پانچ سال رہ کے ہانگ کانگ میں
یہ جی میں ہے کہ طے کروں میں پانچ پانچ میل اک چھلانگ میں
الٰہی، بھر دے بجلیاں سی میرے ان تھکے تھکے سے پاؤں میں
صبوحی میری منتظر ہے، بیس میل دور ۔۔۔ ایک گاؤں میں

۱۹۳۹ء

نقاب کشائی

پردہ اٹھا کے دہر میں فتنہ اٹھا گیا
ہر شے میں اضطراب سا بن کر سما گیا

آیا، تو اک خمار سا آنکھوں پہ چھا گیا
محفل سے اٹھ گیا تو مجھے ہوش آ گیا

نظروں میں میری حسن کی جنت بسا گیا
سینے میں میرے ایک شر رسا چھپا گیا

ذروں میں پارہا ہوں میں اب شانِ ماہتاب
باتوں میں مجھ کو طور کا عالم دکھا گیا

وہ شب کو میرے خانۂ برباد کے قریب
دھیمے سروں میں گیت کوئی گنگنا گیا

ترچھی نظر سے روح میں نشتر چبھو دیئے
نازک لبوں سے قلب میں جادو جگا گیا

اک سانس سے نیاز کی شمعیں بھڑک اٹھیں
اک پھونک سے چراغ خرد کے بجھا گیا

انوارِ حسن سے مرے دن جگمگا دیئے
خوشبوئے زلف سے مری راتیں بسا گیا

بخشا مرے نیاز کو جب ذوقِ بندگی
قدموں پہ میرے عرش کے تارے گرا گیا

قلب و نظر میں پھونک دیا شوقِ جستجو
معصوم آرزوؤں کی کلیاں کھلا گیا

مایوسیوں کی راکھ سے، مجھ ناامید کو
امید کے کھلونے بنانا سکھا گیا

اٹھلا کے میری راہ میں تارے سجا دیئے
لہرا کے میرا بگڑا مقدر بنا گیا

المختصر ندیم سے کافر کو، آن میں
اپنی حسین جادوگری سے لبھا گیا

چلتی ہیں جب ہوائیں تو ہوتا ہے یہ گماں
وہ میرے اجڑے پجڑے گھروندے میں آ گیا

۱۹۳۹ء

کون آیا، یہ کون آیا

ناگاہ اجالا چھایا
سوچوں سے مجھے چونکایا
ماتھے پہ پسینہ آیا
آنکھوں میں نور سمایا — کون آیا، یہ کون آیا

بالوں کے بل مستانے
رخسار ہیں یا میخانے
آنکھیں ہیں یا پیمانے
پلکوں کے نیزے تانے — کون آیا، یہ کون آیا

باہیں شانوں تک عریاں
شانوں پہ بال پریشاں
گالوں میں بھنور سے رقصاں
لب لرزاں آنکھیں خنداں — کون آیا، یہ کون آیا

جلال و جمال

چہرے پہ ملاحت طاری
سانسوں میں نشّے کی دھاری
آنکھوں کے پپوٹے بھاری
ہونٹوں سے لہو سا جاری — کون آیا، یہ کون آیا

اٹھلاتا اور لجاتا
اتراتا اور شرماتا
کلیوں کو پھول بناتا
پھولوں کا رنگ اڑاتا — کون آیا، یہ کون آیا

آنچل اڑتا، سر دھنتا،
سانسوں پہ نقابیں بنتا
ساڑی کا کنارا اچٹتا
ہر چیز کی آہٹ سنتا — کون آیا، یہ کون آیا

تاروں کے محل منگواؤں
پھولوں کے چراغ جلاؤں
پلکوں کا فرش بچھاؤں
غالب کے شعر سناؤں — کون آیا، یہ کون آیا

۱۹۳۹ء

اے نیل کی رانی

(ایک کنیز قلوپطرہ کا سنگار کرتے ہوئے)

رفتار میں اُڑتے ہوئے بادل کی روانی ہونٹوں کے خموں پر شفق آلود سا پانی
اے نیل کی رانی

سینہ ہے، کہ موجوں پہ کنول ناچ رہے ہیں زلفیں ہیں کہ لہراتی ہے ساون کی جوانی
اے نیل کی رانی

آنکھیں ہیں کہ سپنوں میں سموئے ہوئے سپنے باہیں ہیں کہ مرمر میں ہے بجلی کی روانی
اے نیل کی رانی

یہ تیری نظر ہے کہ نئے چاند کا خنجر آواز ہے یا گیت میں تاروں کی زبانی
اے نیل کی رانی

میں اور ترے حسن کی توصیف کا سودا ادنیٰ سی کنیز اور یہ آشفتہ بیانی
اے نیل کی رانی

۱۹۴۰ء

برسات کی ایک رات

اڈے ہیں وہ پربتوں سے طوفاں — ہیں چرخ پہ بدلیاں خراماں
موہوم افق پگھل چکا ہے — اوجھل ہے نظر سے ماہِ تاباں
گھنگھور گھٹا گرج رہی ہے — ٹکراتے ہوں جیسے دو کہستاں

رعشے میں ہے کائنات ساری
ہیں دونوں جہاں نزار و حیراں

میلا سا چراغ جل رہا ہے — کٹیا میں کھڑا ہوں میں ہراساں
انگڑائیاں لے رہی ہیں یادیں — احساس ہے دل میں شعلہ افشاں
یاد آتے ہیں بار بار وہ دن — جب عشق تھا زندگی کا ساماں
غم ایک حقیر واہمہ تھا — سرمایۂ زیست تھا ہر ارماں
سرما کی اداس چاندنی میں — ہوتی تھی صبوحی میری مہماں
آنکھوں میں مسرتوں کے آنسو — عارض میں جوانیاں فروزاں
مسکا ہوا کہنیوں سے چولا — بکھری ہوئی زلفِ ظلمت افشاں

وہ بھیگی ہوئی حنائی پوریں　　سمٹی ہوئی روحِ برق و باراں

ہر بات میں گیت کا ترنم

ہر سانس میں موجِ آبِ حیواں

وہ فرطِ طرب سے میرا کہنا　　"اے میری صبوحی - اے مری جاں

تجھ سے مری زندگی عبارت　　تجھ سے مری رات صبحِ خنداں

بس تیرے وجودِ محترم سے　　لبریزِ حیات یہ شبستاں

بس تیری نگاہِ پُر اثر سے　　میں خفتہ نصیب، گل بداماں

اے کاش شبابِ جاوداں ہو

بے جان ہو نبضِ چرخِ گرداں"

معصوم صبوحی کا لجا کر　　لہرانا وہ چاک چاک داماں

چپ چاپ سمٹ کے ایک جانب　　خاموش حکایتیں سنانا[1]

کچھ میری فسردگی سے بیکل　　کچھ اپنے سکوت پہ پشیماں

عارض پہ وہ اشکِ شرم آلود　　جس طرح گلوں پہ اوس لرزاں

گرتی ہوئی اوڑھنی کے پیچھے　　اٹھتی ہوئی آرزو کی میزاں

کچھ کہنا اگر تو اتنا کہنا

"اس شب پہ دنوں کے ڈھیر قرباں"

طوفان سے دل میں اٹھ رہے ہیں　　اک عمر سے گن رہا ہوں گھڑیاں

---

[1] قوافی کا بنیادی عنصر "صوت" ہے۔ ندیمؔ

جلال و جمال

احساس پہ ہے جمود طاری — امید ہے رزنِ طاقِ نسیاں

کچھ سوچ رہے ہیں مدتوں سے — موہوم شباب کے شبستاں

دل پر ہے خرد کا رنگ غالب — سینے میں نزاعِ کفر و ایماں

اب سود و زیاں کی الجھنوں میں — کٹ جاتا ہے دورِ برق و باراں

شاعر تو کبھی کا مر چکا ہے

اب تو ہے ندیمؔ صرف انساں

۱۹۴۰ء

سپاہی — مورچے میں

نہ جانے یہ کیا انقلاب آگیا　　یہ رعشہ سا کیوں دہر پہ چھا گیا
وجود اس قدر کپکپاتا ہے کیوں　　رگوں میں لہو سرسراتا ہے کیوں
برستی ہیں آنکھیں، ترستے ہیں لب　　یہ بالیدگی ہے مگر بے سبب
یہ کیوں ملتہب روح کجلا گئی　　یہ کس کی مجھے آج یاد آگئی

خیالوں کی خوابیدگی کیا ہوئی
سپاہی کی سنجیدگی کیا ہوئی

گرجتا ہے، بجتا ہے میدانِ جنگ　　نرالے ہیں ہٹنے جھپٹنے کے ڈھنگ
دھوئیں میں مسلسل دھماکوں کی گونج　　گرج کا تواتر، کڑاکوں کی گونج
اڑیں گولیاں سنسناتی ہوئی　　بڑھیں سیٹیاں سی بجاتی ہوئی
فضاؤں سے گرتے ہیں بم پے بہ پے　　بگولے اٹھے، مورچے اڑ گئے

سنا ہے کہ یہ چاندنی رات ہے
مگر چاند پہ موت کا ہاتھ ہے

تصور کا فردوس بے رنگ ہے
مگر دل کی دھڑکن ہم آہنگ ہے
یہ دھڑکن ہے یا نرم قدموں کی چاپ
اچھوتا شبستاں! انوکھا ملاپ!
پریشاں پریشاں سا انداز ہے
ہراساں ہراساں سی آواز ہے
مرے اوّلیں عشق کی یادگار!
مری زیست کی سب سے پہلی بہار!

تری آمد اک دلربا راز ہے
ترا لطف ہے، میرا اعجاز ہے

ادھر مورچے میں دبک جا، کہ تو
نہیں جانتی تند گولوں کی خو
خدا کے لیے سر اٹھا کر نہ دیکھ
مری سمت گردن بڑھا کر نہ دیکھ
دہانے وہ توپوں کے پھر کھل گئے
وہ نظارے پھر خاک سے دھل گئے
سمٹ آ مری روح میں میری جاں
مری روح ہے عالم بیکراں

یہاں گولیاں ہیں سبک بوندیاں
یہ ہے عشق کا معبدِ جاوداں

۱۹۴۰ء

اندمال

بیت گیا ساون کا مہینہ ـــــ اے کافر انداز حسینہ
نیندوں سے مخمور ہیں آنکھیں ـــــ اور تھکن سے چور ہیں آنکھیں
آنا اب بیکار ہے تیرا ـــــ مردہ اب احساس ہے میرا
تیری گوری گوری باہیں ـــــ میخانہ بر دوش نگاہیں
لب پہ ہنسی، ماتھے پہ پسینہ ـــــ اور سینہ قاروں کا دفینہ
یہ پتلی آواز کا جادو ـــــ یہ نیلے ملبوس کی خوشبو
کانوں میں موتی آویزاں ـــــ ہر موتی میں بجلی رقصاں
ہونٹوں پہ بوسے رقصیدہ ـــــ اور بیباک نظر دزدیدہ
ریشم کا کمخواب کا تکیہ ـــــ تاروں پہ پھولوں کا بستر
اپنے نشوں میں چور جوانی ـــــ یہ تیری بھرپور جوانی
اب سب کچھ بیکار ہے پیاری ـــــ تجھ سے جی بیزار ہے پیاری
دل نے اتنے چرکے کھائے ـــــ تو دیکھے تو شرما جائے

رونے میں گذریں برساتیں
سونے دن، بے رونق راتیں

جلال و جمال

جا اور رقصِ مستانہ کر سرمایہ داری کے در پر
وہ در جس پر میں نے دیکھے مزدوروں کے خون کے چھینٹے
کچلے سینے بیواؤں کے اور جگر بے بس ماؤں کے
دیتی ہیں جس در پہ صدائیں بھوک کی ماری دوشیزائیں
بے گھر بچے، بے زر انساں اک باسی روٹی کے خواہاں
تیرا گھر زردار کا دل ہے تیرا گھر عیّار کا دل ہے
میں اک بھولا بھالا شاعر پردیسی سیلانی طائر
روتے روتے بھی جی لوں گا مے نہ ملی، آنسو پی لوں گا
بیت گیا ساون کا مہینہ کھیل ہے اب یہ مرنا جینا
ڈوبا امیدوں کا سفینہ اے کافر انداز حسینہ

نیندوں سے مخمور ہیں آنکھیں
اور تھکن سے چور ہیں آنکھیں

۱۹۴۰ء

ذرا سی بات

وہ کونپلوں کے بوجھ سے شاخیں لچک گئیں، پھولوں کی نکہتوں سے فضائیں بہک گئیں
وہ جھاڑیوں میں بجنے لگے بوندیوں کے ساز وہ خاک پر برسنے لگے بادلوں کے راز
باریک ندیوں کے وہ میداں میں حاشیے ٹھنڈی زمیں پہ جیسے مچلتے ہوں اژدہے

یوں محوِ وجد و رقص ہیں نیموں کی ڈالیاں
انگڑائی جیسے نیند میں لیں گاؤں والیاں

یہ سامنے اندھیری چٹانوں کے آس پاس کس آسرے پہ بھیڑیں کھڑی ہیں اداس اداس
یہ کس کی اوڑھنی سے ہوائیں ہیں گرمِ ناز چہرے پہ کس کے کھیلتے ہیں گیسوئے دراز
یہ کس کی چشمِ مست جھپکتی ہے بار بار چادر یہ کس کے سر سے ڈھلکتی ہے بار بار

بھیگے ہوئے لباس سے چھنتا ہوا جمال
ڈوبا ہوا شباب کی مستی میں بال بال

"لڑکی! تو کس غریب کی آنکھوں کا نور ہے؟ بتلا یہاں سے گاؤں ترا کتنی دور ہے؟
بھٹکی ہوئی ہے تو تو مرے ساتھ چل چکنی ہے راہ۔ دیکھ، ذرا رک۔ ذرا سنبھل

جلال و جمال

بھیڑوں کو رام کرنے کے آتے ہیں مجکو ڈھب   یہ میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہیں سب

کیچڑ ہے اس طرف تو - ادھر سے پلٹ کے آ

لے میرا ہاتھ تھام کے ندی پھلانگ جا،"

اتنی سی بات، اور یہ ہنگامۂ خیال   اے دل سنبھل سنبھل، مرا جینا نہ کر وبال

شہروں کی زندگی سے مری روح تنگ ہے   یہ حبس میرے دل کے لئے وجہ تنگ ہے

صحرا میں آ بسا تھا کہ شاید سکوں ملے   لیکن یہاں پہنچتے ہی یہ تازہ گل کھلے

تو میرا ساتھ دے، تو یہاں سے نکل چلیں

اور آسماں کے دھندلے ستاروں میں جا بسیں

۱۹۴۰ء

جنگل کی ساحرہ

وہ آئی اور مجھ کو اپنا بنا کے چل دی
آنکھیں ملا کے چل دی، دل میں سما کے چل دی

جس قصرِ عنبریں میں آ کر کیا بسیرا
اس قصرِ عنبریں پر بجلی گرا کے چل دی

بل کھا رہا ہے اب تک دل جن کی کروٹوں سے
آغازِ عاشقی کے وہ گیت گا کے چل دی

یہ کائنات ساری، آنسو بہا رہی ہے
ایسی حسیں ادا سے وہ مسکرا کے چل دی

کوندا سا ایک لپکا، خوابوں کی ظلمتوں میں
دامن تھما کے دیکھا۔ دامن چھڑا کے چل دی

یہ گرم گرم آنسو۔ یہ سرد سرد آہیں
اک نرم نرم طوفاں دل میں اٹھا کے چل دی

سینے میں جھلملائے احساس کے ستارے
ادراک و آگہی کی شمعیں بجھا کے چل دی

پہلے مجھے سکھائی تقدیس دیوتوں کی
پھر چاند کا سنہری مندر دکھا کے چل دی

نشتر زنی کی دھن میں غنچے بکھیر ڈالے
جب دل چرا کے پلٹی، موتی لٹا کے چل دی

کچھ دیکھتی ہیں آنکھیں، کچھ سوچتی ہیں آنکھیں
ہلکا سا اک دھندلکا ہر سو اڑا کے چل دی

محسوس ہو رہا ہے، کچھ پا کے کھو چکا ہوں
پردے اٹھا کے آئی، آنکھوں پہ چھا کے چل دی

وہ برق گام لڑکی، جنگل کی ساحرہ تھی
مرنے کا اذن دے کر جینا سکھا کے چل دی

۱۹۴۰ء

قانونِ قدرت

گلیوں کی شمعیں بجھ گئیں اور شہر سونا ہو گیا
بجلی کا کھمبا تھام کر بازکا سپاہی سو گیا

تاریکیوں کی دیویاں کرنے لگیں سرگوشیاں
اک دھیمی دھیمی تان میں گانے لگی خاموشیاں

مشرق کے پربت سے پرے ابھریں گھٹائیں یک بیک
انگڑائیاں لینے لگیں بے خود ہوائیں یک بیک

تارے نگلتی بدلیاں چاروں طرف چھانے لگیں
چھم چھم پھواروں کی جھڑی دھرتی پہ برسانے لگیں

کُتّے اچانک چونک کر بھونکے، دبک کر سو گئے
بے رس چچوڑی ہڈیوں کی لذتوں میں کھو گئے

مائیں لپکتی ہیں کہیں، بچے بلکتے ہیں کہیں،
اور کھاٹ لینے کے لئے بوڑھے اُچکتے ہیں کہیں

اک سرسراہٹ سی اٹھی لہرائی۔ تھم کر رہ گئی
ہر چیز نے آنکھیں ملیں ہر چیز جم کر رہ گئی

پھر گنگناتی ظلمتوں کا سحر ہر سو چھا گیا
بادل کہیں گم ہو گئے۔ تاروں پہ جوبن آ گیا

قدرت کے سب چھوٹے بڑے قانون ہیں یکساں مگر
پردے پڑے ہیں جابجا چھنتی نہیں جن سے نظر

انسان کا معصوم دل تاریک۔ سونا شہر ہے
جس کے تلے احساس کی چنگاریوں کی لہر ہے

جب دیکھتا ہے وہ کہیں بدمست نگھٹ والیاں
گالوں کو جن کے چومتی ہیں پتلی پتلی بالیاں،

زلفیں گھٹاؤں کی طرح۔ آنکھیں ستاروں کی طرح
چلنا ہواؤں کی طرح۔ رنگت شراروں کی طرح

لہنگے کی لہروں کے تلے کھن سے پاؤں رقص میں
پگڈنڈیوں کے اس طرف گاگر کی چھاؤں رقص میں
سینے پہ چھلکتے میکدے اور ہونٹ پیمانوں کے لب
ٹخنوں پہ بجتی جھانجنیں ہنسنا ہنسانا بے سبب
یہ دیکھ کر انگڑائیاں لیتا ہے دل انسان کا
ناگاہ ہر دھڑکن پہ ہوتا ہے گماں طوفان کا

گلیوں میں چھپ جاتی ہیں جب یہ چلتی پھرتی بجلیاں
ہوتا ہے طاری روح پر سنسان راتوں کا سماں

۱۹۴۰ء

التماس

طبعِ نازک پہ اگر میری فغاں بار نہ ہو
ملتمس ہوں کہ مرے عشق سے بیزار نہ ہو
حسن کے جذبۂ پندار میں سرشار نہ ہو

سانتا ہوں مری آشفتہ سری ہے مشہور
اور رہتا ہوں میں افکارِ دلِ افگار میں چور
راتیں سنسان مری، دن مرے بیگانۂ نور

میں تو حیران ہوں اے ملکۂ اقلیمِ جمال
اصطلاحات کے محکوم ہیں کیوں تیرے خیال
تو بایں قوتِ پرواز ہے کیوں بے پروبال

تو اگر چاہے تو چھٹ جائیں گھٹائیں ساری
ایک لذت میں بدل جائے غمِ ناداری
عین صحت ہے محبت کی حسیں بیماری

تیرے دل پر ہے مگر مذہب و ماحول کا زنگ
بس اسی زنگ سے دھندلے ہیں تری روح کے رنگ
دل کو کیوں تو نے سمجھ رکھا ہے اک پارۂ سنگ!

تیرے افکار پہ اہرمن و یزداں کا فسوں
تیرے احساس کے دریا میں المناک سکوں
تو مرے سوزِ دروں کو بھی سمجھتی ہے جنوں

جلال و جمال

کون یہ تجھ کو بتائے کہ یہ فرسودہ نظام
درحقیقت ہے ان اسلافِ بداندیش کا کام
جن کا شہکار ہے تمییزِ شہنشاہ و غلام

زر کو معیارِ شرافت نہ بنا اے پیاری
ظاہری جاہ کے دھوکے میں نہ آ اے پیاری
اپنے احساس کو آئینہ دکھا اے پیاری

حسن کو مذہب و ماحول کا محکوم نہ کر
اپنے جلووں کو مری دید سے محروم نہ کر
عشق کے ننھے کمانڈر کو مغموم نہ کر

۱۹۴۱ء

آخری سجدہ

مری زندگی ترے ساتھ تھی، مری زندگی ترے ہات تھی
مرے قلب میں ترا نور تھا، مرے ہونٹ پر تری بات تھی
مری روح میں ترا عکس تھا، مری سانس میں تری باس تھی
ترے بس میں میرا شباب تھا، ترے پاس میری ہر آس تھی
ترے گیت گاتی تھی جب بھی میں، مجھے چھیڑتی تھیں سہیلیاں
مگر ان پہ کھل نہ سکیں کبھی مری زندگی کی پہیلیاں
میں ترے جمال میں محو تھی، میں ترے خیال میں مست تھی
مجھے کیا سمجھتیں وہ لڑکیاں، کہ میں اپنے حال میں مست تھی

تری شان میں مری شان تھی، ترا دبدبہ مرا ناز تھا
تری دلبری مری جان تھی، تری عاشقی مرا راز تھا

مگر اب شباب گذر گیا، تو ترا نیاز بھی مر گیا
مرے رخ پہ جھریاں دیکھ کر تو پلٹ کے جانے کدھر گیا

جلال و جمال

میں تری تلاش کروں، مگر مرا پستیوں میں مقام ہے
تو مثیلِ ماہِ تمام ہے، تو رہینِ رفعتِ بام ہے
اگر ایک پل کے لئے کبھی تو بلندیوں سے اتر سکے
مرے اجڑے بچھڑے دیار سے اگر ایک بار گذر سکے
تو مرے خلوص کا واسطہ، مری آرزو، مری آس، آ
مری بات سن، مری بات سن، مرے پاس آ، مرے پاس آ

کوئی التجا نہ کروں گی میں، کوئی دوش بھی نہ دھرونگی میں
ترے پائے ناز پہ سر جھکا کے بس ایک سجدہ کروں گی میں

۱۹۴۱ء

ظلمتیں منوّر

دھندلی شاموں میں لپکتے ہوئے آنچل کی قسم
زندگی تجھ پہ ہے اترائی ہوئی
رفعتِ کوہ پہ مچلے ہوئے بادل کی قسم
خلوتِ دل پہ ہے تو چھائی ہوئی
میں تجھے چھوڑ کے پردیس چلا آیا ہوں
بات گو قابلِ اظہار نہیں
تیرے امید کے محلوں کو گرا آیا ہوں
اپنے اس جرم سے انکار نہیں
لیکن اخلاق کی دنیا کے قوانینِ کہن
عشق پر رحم نہیں کھا سکتے
یہ گپھائیں، یہ صنوبر، یہ کھنڈر، یہ گلشن
قسمتوں سے نہیں ٹکرا سکتے

پیٹ بھرنے کے لیے حسن سے رشتہ توڑا
بیچ کر پھول، خریدے کانٹے
جوئے زریں میں محبت کا سفینہ چھوڑا
سیپیاں پائیں، ستارے بانٹے
ہاں مجھے یاد ہیں ساون کی وہ بھیگی راتیں
بھوری بدلی میں وہ دبکا ہوا ماہ
گنگناتی ہوئی کھیتوں میں حسیں برساتیں،
شیشموں میں وہ لچکتی ہوئی راہ
ہاں مجھے یاد ہیں وادی کے وہ مبہوت درخت
پر سمیٹے ہوئے پنچھی، خاموش
وہ درختوں میں نئی گھاس کے ترشے ہوئے تخت
یعنی فطرت کی وہ پیاری آغوش
ہاں، مجھے یاد ہے وہ صبح کا سہما ہوا نور
مسجدوں سے وہ اذانوں کی صدا
وہ گجردم کی ہواؤں سے فضائیں معمور
قصرِ مشرق کا وہ پٹ کھلتا ہوا

جلال و جمال

ہاں مجھے یاد ہیں بالوں میں وہ چھپتے ہوئے گال

پتلے ہونٹوں کا وہ حسن لرزاں

وہ جھپکتی ہوئی آنکھیں، وہ بہکتی ہوئی چال

وہ حیاؤں میں تقاضے سے نہاں

چار بھیگی ہوئی آنکھوں کا وہ پیمانِ وفا

بات پر بات، خموشی، ہستی،

ان دنوں روح میں ناپید تھی فکرِ فردا

یعنی آزاد تھی دل کی بستی

آہ، لیکن یہ زمانہ تھا بس اک خوابِ حسیں

نیند کی ایک دلآویز اڑان

تیری معصوم جوانی کا خیالِ شیریں،

برلبِ دل کی لرزتی ہوئی تان

مادہ، روح پہ اک سنگِ گراں بن کے گرا

پنکھڑی عشق کی مرجھا سی گئی

نظر آنے لگا عالم میں غبار اڑتا ہوا

روح چونک اٹھی تھی گھبرا سی گئی

اور اب دھوپ سے تپتے ہوئے بازاروں میں
عشق دم توڑ رہا ہے کب کا
اہلِ ثروت کی اٹھائی ہوئی دیواروں میں
تیرا آزاد ندیم آدیکا
یہ بزرگوں کا بنایا ہوا بے کیف نظام
ایک لعنت ہے جوانوں کیلئے
اف یہ مجرے، یہ خوشامد، یہ قصیدے، یہ سلام
سیسہ پگھلا ہوا کانوں کے لئے
پھر بھی جب روح پہ کھویا ہوا رنگ آجائے
دل کا سب میل اچانک دھل جائے
سطحِ احساس سے چھٹ جاتے ہیں گہرے سائے
عرش کا جیسے دریچہ کھل جائے
مرے پہلو میں تو چپ چاپ چلی آتی ہے
زلف بر دوش، سمٹتی، ہنستی،
خشک ماحول پہ اک آن میں چھا جاتی ہے
دامنِ کوہ کی ننھی بستی

جلال و جمال

مری محبوب مرے عشق سے بیزار نہ ہو

ان اندھیروں میں اجالا ہو گا

دیکھ پیمانِ وفا کشتۂ افکار نہ ہو

بول اخلاص کا بالا ہو گا

۱۹۴۱ء

پروازِ جنوں

تنگ راہوں پہ اڑے جاتے ہیں میرے پاؤں
اور سرگوشیاں کرتا ہے یہ سارا گاؤں
ایک کہتا ہے — "یہ دیوانہ کدھر جائے گا" دوسرا کہتا ہے — "تا حدِ نظر جائے گا"
"جی میں آئی تو افق سے بھی گذر جائے گا گر کے بے چارہ کسی کھوہ میں مر جائے گا"
میں رواں ہوں مگر اک کھنڈر کی جانب
تشنہ لب جیسے بڑھے ساغرِ زر کی جانب

شام پڑتے ہی وہ بستی سے نکل آتی ہے
سامنے اجڑے ہوئے قصر میں چھپ جاتی ہے
بیٹھی ہوگی کسی دیوار کے سائے میں — خموش ! اپنی نوخیز جوانی کے نشے میں مدہوش
کیف آنکھوں میں تمناؤں کا سینے میں خروش عیشِ امروز کی دنیا میں نہ فردا ہے نہ دوش
اوڑھنی سر پہ سیاہ رنگ کی ڈالے ہوگی،
اپنے اڑتے ہوئے بالوں کو سنبھالے ہوگی

چاپ سنتے ہی مرے پاؤں کی۔ چونک اٹھے گی
دلِ معصوم میں اک آگ سی ہونک اٹھے گی
جب مجھے سامنے پائے گی، تو شرمائے گی، سر جھکائے گی، لجائے گی سمٹ جائے گی،
میں بلاؤں گا تو پلکوں کو وہ جھپکائے گی اور جس وقت بہم ہم کو ہنسی آئے گی
وہ یہ پوچھے گی: "بھلا آپ یہاں کیوں آئے؟"
میں کہوں گا — "یہ مرے بخت سے پوچھا جائے"

— اور ہو جائے گی جب دہر پہ مستی طاری
میرے پہلو میں سرک آئے گی میری پیاری
میں سناؤں گا اسے درد بھرے افسانے کیوں چھلک جاتے ہیں، لبریز ہوں جو پیمانے
اپنے بن جاتے ہیں اک آن میں کیوں بیگانے کیسے دیوانوں نے آباد کئے ویرانے
اور جب کھولوں گا ماحول و وراثت کے راز
تیز سانسوں میں بدل جائے گی اس کی آواز

ماند پڑ جائیں گے جب چرخ پہ تاروں کے ہجوم
پھیل جائیں گے پُراسرار غباروں کے ہجوم
بولے گی — دھیرے سے رکھ کر مرے شانے پر سر "دل میں قوت ہو تو ماحول سے کیا خوف و خطر

میں کسی اور کی ہو جاؤں تو تف ہے مجھ پر   میرے اس عہد کے ضامن ہیں یہ دو دیدۂ تر
دہر کا خوف نہیں آپ اگر میرے ہیں،
آپ اک آج نہیں، زندگی بھر میرے ہیں"

یہ کھنڈر رہے! یہ فصیلیں ہیں! اے دل، خاموش!
ہو نہ جائے وہ کہیں شرم کے مارے روپوش
—لیکن افسوس، یہ کیا سانحہ اب یاد آیا   اس نے ماحول کے عفریت سے دھوکا کھایا
عشق و الفت میں نہ غربت کا مداوا پایا   سورج ابھرا تو مرا چاند گہن میں آیا
بک گئی وہ کسی زردار زمیندار کے ہاتھ
اور سونپا مجھے تقدیرِ فسوں کار کے ہاتھ

۱۹۴۱ء

ایک ہرجائی سے

مضمحل روح کے چپ چاپ نہاں خانوں میں
چھپ کے بیٹھا ہے کوئی نغمہ نواز
سرد احساس کے ویران چمنستانوں میں
ایک پرچھائیں ہے محوِ پرواز

جیسے اجڑے ہوئے ایوان کا پُرہول سکوت
قلبِ سیّاح پہ چھا جاتا ہے
یونہی افسردہ خیالات پہ ماحول کا بھوت
شبِ تاریک میں منڈلاتا ہے

ننگی لاشوں کی قطاریں نظر آتی ہیں مجھے
کھوکھلی آنکھوں میں شعلے رقصاں
کپکپاتے ہوئے دانتوں سے ڈرانی ہیں مجھے
جوشِ وحشت میں پریشاں، لرزاں

ہر طرف رینگتے ہیں سطحِ تصور پر ناگ،
پھن اٹھاتے ہیں سرک جاتے ہیں
ان کے ہونٹوں سے برستا ہے وہ زہریلا جھاگ
جس سے جذبات دہک جاتے ہیں

اور میں سہما ہوا، کھویا ہوا، گھبرایا ہوا
تیرے پہلو میں سمٹ جاتا ہوں

تیرے پہلو میں سمٹ جانے سے شرمایا ہوا
اسی دوزخ کو پلٹ جاتا ہوں

چند گھڑیوں کی جو تسکین مجھے ملتی ہے
اس سے جم جاتی ہے شعلوں کی زبان
ایک لمحے کے لئے دل کی کلی کھلتی ہے
زندگی ہوتی ہے خنداں، رقصاں

یک بیک پھر وہی کانٹے سے الجھ جاتے ہیں
میرے احساس کے پیراہن میں
پھر تصور پہ وہی بھوت سے منڈلاتے ہیں
خاک اڑتی ہے مرے گلشن میں

اس لئے اب تری جنت سے نہ جاؤں گا کبھی
"خواب آباد" میں سو جاؤں گا
ایک مرکز پہ تو جذبات کو لاؤں گا کبھی
کچھ نہ پاؤں گا تو کھو جاؤں گا

۱۹۴۱ء

شکاری

جبیں پہ ایک موجِ رنگ و نور سی لئے ہوئے
شراب سی پئے ہوئے
درِ بہشت مست انکھڑیوں میں وا کئے ہوئے
مرے خدا یہ کون ہے!

قدم قدم پہ ایک فتنہ سا جگا رہی ہے وہ
کچھ ایسے آ رہی ہے وہ
بلند و پست پر نشہ سا بن کے چھا رہی ہے وہ
مرے خدا یہ کون ہے!

لبوں پہ ایک کپکپی سی وقفِ پیچ و تاب ہے
نگاہ محوِ خواب ہے
یہ عکسِ ماہتاب ہے کہ روحِ آفتاب ہے
مرے خدا یہ کون ہے!

وہ مجھ کو دیکھتے ہی اپنے راستے سے ہٹ گئی
سمٹ کے یوں پلٹ گئی
کہ جیسے اک پتنگ کی فضا میں ڈور کٹ گئی
مرے خدا یہ کون ہے!

مجھے قریب دیکھ کر کچھ اس طرح لجا گئی
کچھ ایسے پیچ کھا گئی
کہ ساری کائنات پر ردائے خواب چھا گئی
مرے خدا یہ کون ہے!

وہ تیز تیز جا رہی ہے بادلوں کی چھاؤں میں
وہ سامنے کے گاؤں میں
مگر یہ بیڑیاں سی کیوں پڑی ہیں میرے پاؤں میں
مرے خدا یہ کون ہے!

وہ اس کی میلی اوڑھنی، یہ میرا اجلا پیرہن
یہ پیرہن کا بانکپن
مگر مرے لباس پر ہیں اس کے ناز خندہ زن
مرے خدا یہ کون ہے!

بس اب اسی جگہ پہ اپنا جھونپڑا بناؤں گا
اسی کے گیت گاؤں گا
کبھی تو اس کو اپنے جذبِ دل سے کھینچ لاؤنگا
مگر بتا، وہ کون ہے!

۱۹۴۱ء

اُداس محبوبہ سے!

کتنا خاموش ہے سوئے ہوئے نیموں کا ہجوم
موڑ پر مست سی ندی کے وہ ملّاح کا گھر
اُجلی اُجلی سی گھٹاؤں میں وہ بہتا ہوا چاند
ایسے ماحول میں کیوں کشتۂ افکار ہے تو
تجھ کو شکوہ ہے امیدوں کی زبوں حالی کا
سمجھتی ہے کہ جب بزمِ جہاں فانی ہے
اعری ہے تری دانست میں افسانۂ غم
ولھویں سال نے کیا تجھ پہ قیامت ڈھائی
فسانوں کا تقاضا، نہ ترانوں کی ترنگ

زندگی تک نظر آتی ہے خیالِ موہوم
اک کھلونا سا مجھے دور سے آتا ہے نظر
دھندلے دھندلے سے کسی خواب کی مانند ہے ماند
کیوں مرے ولولۂ شوق سے بیزار ہے تو
خوف، شاہینِ تمنا کی گراں بالی کا
لذتِ زیست کا احساس بھی نادانی ہے
زندگی جس کے اثر سے ہے مسلسل ماتم
خشک منطق میں اُلجھتی ہے تری انگڑائی
نہ لپکتی ہوئی باہوں میں لپٹنے کی امنگ

زندگی خواب سہی، خواب کو ویراں تو نہ کر
میرے فردا کے ہیولوں کو پریشاں تو نہ کر

م نجوِ شب کی پراسرار سی بے پایانی
تشر ابر کے ٹکڑوں میں ہے مہتاب رواں

شاید اب تک تری نظروں نے نہیں پہچانی
جل پری سطح پہ دریا کے ہے یا رقص کناں

اونگھتی لہروں میں تاروں کی مچلتی گیندیں
سیم سیال میں مرمر کی ابلتی گیندیں

یہ فضاؤں میں تعطر کی خمار انگیزی
گھاس پر اوس کے قطروں کی جواہر ریزی

یہ لچکتی ہوئی شاخوں کی کمانوں کا تناؤ
لوریاں دیتا ہوا نرم ہواؤں کا بہاؤ

ایسی جنت میں جہنم کا تصور ہے محال
گل پہ کھنچے ہیں تو ادراک کا دشنہ نہ نکال

جب شگوفے کے تبسم میں ہیں اسرارِ حیات
کیوں فقیہوں کے خرافات ہوں سامانِ نجات

جب مہ و مہر کی کرنیں ہیں صحیفوں کی سطور
اصطلاحات سے کیوں ذہن کو کرلیں مجبور

دیکھ یہ گھاس پہ موہوم سے کیڑے کا خرام
اس کے ادراک سے بالا ہے دو عالم کا نظام

اک ذرا چھو تو اسے، کانپ کے بل کھائے گا
اور اس گھاس کی پتی سے اتر جائے گا

زندہ رہنا ہے تو جینے کی ہوس پیدا کر
زہر ہے زیست تو اس زہر میں رس پیدا کر

اپنے اس شاعرِ آوارہ و بدنام کو دیکھ
اس کے افکار میں ڈھالے ہوئے اصنام کو دیکھ

یہی اصنام ہیں ان تازہ خداؤں کے حریف
جن کی جبروت سے بیزار ہے احساسِ لطیف

جن کے قانون ہیں قرنوں کی غلامی کے نشاں
کاٹ لی جن کے خلیفوں نے صداقت کی زباں

خونِ دہقاں سے نکھرتا ہے پھریرا جن کا
حق کے تابوت پہ ہوتا ہے بسیرا جن کا

میرے اصنام سے ڈرتی ہے خدائی ان کی
ان چٹانوں سے چٹختی ہے کلائی ان کی

کون کہتا ہے یہ بے وقعت و بے مایہ ہیں
یہی اصنام مری زیست کا سرمایہ ہیں

وقت پر ان کی قباؤں سے جھڑیں گے وہ شرر
شب کے جنگل سے نکالیں گے جو ایوانِ سحر

قبل اس کے مگر اے شمعِ شبستانِ خیال — کیوں کریں قوم کے اجڑے ہوئے ماضی کا ملال

ہو کے مایوس مرے عشق کو بدنام نہ کر
ایک مجبور کو یوں موردِ الزام نہ کر

موت کیا چیز ہے؟ افسردہ خیالات کا بھوت — موت کیا چیز ہے؟ تاریک نگاہی کا ثبوت
موت دراصل تصور کی پریشانی ہے — موت انسان کے ادراک کی حیرانی ہے
زندگی موت کا عنواں ہے تو ڈرنا کیسا! — ایک نقطے پہ تجلّی کا ٹھہرنا کیسا!
میں تو یہ پوچھتا ہوں، کیا یہ خلّاقی ہے — یعنی انسان تو فانی ہے، خدا باقی ہے
جزو فانی ہے تو پھر کل کی بقا کیا معنی — یہ بھی فانی ہے تو پھر خوفِ خدا کیا معنی
جب وہ باقی ہے تو ہم موت سے کیوں گھبرائیں — کیوں نہ پہنائی عالم میں چھکتے جائیں
کیوں نگاہوں میں ہو الفت کی زبوں انجامی — جبکہ ظلمت ہے حقیقت میں نظر کی خامی
نرم سبزے پہ تھرک نیم کی شاخوں میں جھول — اپنے بالوں میں پرو اوس میں بھیگے ہوئے پھول
سمت ندی میں لپک نور کی قوسوں میں نہا — مجھ کو سینے سے لگا، دھڑکتے ہوؤں پہ جھکا

قہقہہ بار حقیقت ہیں یہی جینا ہے
فرصتِ عیش تو عرفان کا اک زینہ ہے

۱۹۳۴ء

شہر کی رانی

تیرے ہونٹوں کے شفق رنگ تکونی گوشے — کپکپی سی مرے جذبات میں بھر دیتے تھے
ان گنت اجنبی لب ان میں جھلک کر، لیکن — ٹھیکری سی مرے احساس پہ دھر دیتے تھے

تیرے بالوں کی مہکتی ہوئی تاریکی میں — مجھ کو افکار کے فردوس نظر آئے تھے
یک بیک ان میں مچلتے ہوئے ہاتھوں کے ہجوم — بھوت بن کر مرے افکار پہ منڈلائے تھے

تیرے اظہارِ محبت پہ یقیں تھا مجھ کو — میں نے جانا کہ اچھوتی ہے جوانی تیری
جس کو بہتان سمجھتی تھی مری صاف دلی — تیرے ماضی نے سنا دی وہ کہانی تیری

تیری تعلیم کی بنیاد ہے آزادروی — حسن کو عرش کا اک راز سمجھتا ہوں میں
مجھ کو مرغوب ہیں پہ چٹکی ہوئی کلیاں، لیکن
نکہتوں کا انہیں غماز سمجھتا ہوں میں

۱۹۴۲ء

دھارا

وہ اُمڈتے ہوئے دریا کا بپھرتا ہوا پانی
وہ ڈھلانوں پہ تھرکتی ہوئی موجوں کی روانی

وہ لپٹتی ہوئی لہروں پہ لپکتے ہوئے بجرے
وہ ابھرتے ہوئے بجرے، وہ دبکتے ہوئے بجرے

وہ بکھرتے ہوئے چھینٹوں کا کف آلود ترانا
وہ چمکتے ہوئے ساحل پہ چٹانوں کا نہانا

وہ الجھتی ہوئی موجیں، وہ مچلتی ہوئی موجیں
وہ کناروں کی بلندی سے اچھلتی ہوئی موجیں

وہ لڑھکتے ہوئے تابوت — درختوں کے جنازے
وہ جنازوں پہ حسیں جھاگ کے بکھرے ہوئے غازے

وہ لپکتے ہوئے میداں کو کترتا ہوا دھارا
وہ دھماکوں پہ دھماکے، وہ چٹختا ہے کنارا

یہ گرجتی ہوئی دنیا مری آہوں کی امیں ہے
وہ صباحت سی یہاں ہے جو زمانے میں نہیں ہے

جلال و جمال

وہ حیاؤں کے تقاضے، وہ محبت کی امنگیں
وہ حسینوں کے ہیولے، وہ جوانی کی ترنگیں
وہ کڑکتی ہوئی دھوپ اور وہ منڈیروں کے سہارے
وہ سلگتی ہوئی، جلتی ہوئی نظروں کے اشارے
وہ سمٹتی ہوئی گلیوں میں لپکتے ہوئے سائے
وہ سسکتے ہوئے نیموں میں دبکتے ہوئے سائے
نہ عزیزوں ہی کی پروا تھی، نہ بدخواہوں کا دھڑکا
کہ وہ برکھا نہیں جس میں کوئی بادل نہیں کڑکا
نہ وہ دنیا ہے نہ دل ہے، نہ وہ بادہ ہے نہ ساقی
فقط اک درد ہے زندہ، فقط اِک یاد ہے باقی
مگر اب تک مری آنکھوں کو وہ منظر نہیں بھولا
یہ گرجتا ہُوا سیلاب ہے اس یاد کا جھولا
وہی وحشت، وہی شدت، وہی بے چین روانی
اسی پانی میں مجسم ہے جوانی کی کہانی

۱۹۴۲ء

ترکِ دریوزہ

اب نہ پھیلاؤں گا میں دستِ سوال

میں نے دیکھا ہے کہ مجبور ہے تو
میری دنیا سے بہت دور ہے تو
تیری قسمت میں جہانبانی ہے
میری تقدیر میں حیرانی ہے
بزمِ ہستی میں سرافراز ہے تو
میرے انجام کا آغاز ہے تو
تو ہے آسودۂ فرشِ سنجاب
خلد ہے تیرے شبستاں کا جواب
مسجدِ شہر کی محراب کا خم
تیری تقدیس کی کھاتا ہے قسم
میں ہوں اک شاعرِ آوارہ مزاج
اور ترے فرق پہ اخلاق کا تاج

میں نے عالم سے بغاوت کی ہے
تو نے ہر شے سے محبت کی ہے
میں نے مذہب پہ بھی الزام دھرا
تو نے وہموں کو بھی ایماں سمجھا
گل کہاں اور خس و خاشاک کہاں
عالمِ پاک کہاں، خاک کہاں

اب نہ پھیلاؤں گا میں دستِ سوال

۱۹۴۲ء

شاہدِ ہرجائی

میں نے رنگ و نور کے پردے دیکھ کے دھوکا کھایا
میری پیاری! اب میں سمجھا، تو نے مجھے پھسلایا

میں نے تازہ پھول سمجھ کر تیرے عارض چومے
لیکن جب گھر آیا، تو ہونٹوں کو جلتا پایا

میں نے تیری مشکیں زلفیں آنکھوں پر بکھرائیں
اور ہٹائیں تو ہر جانب بادل سا گھر آیا

دور سے تیرے تاباں ماتھے کو سمجھا آئینہ
غور سے دیکھا تو اس کی تاریکی پر شرمایا

میں نے تیرے چہرے کی رنگت میں جنت دیکھی
لیکن جونہی غازہ اترا، سب کچھ پھیکا پایا

میں نے تیری آنکھوں میں میخانے رقصاں دیکھے
پیاس بجھانی چاہی تو کاجل نے راز بتایا

اب تک تیرے جسم کو سمجھا ایک اچھوتا سپنا
جس کو چھو کر میں نے امیدوں کا محل گرایا

تجھ کو کھو کر اب خلوت میں بیٹھا سوچ رہا ہوں
کیوں اپنے البیلے دل کو ناحق روگ لگایا

لیکن میں ممنون ہوں تیرا ہرجائی شہزادی
تو نے میری نادانی کو پل بھر تو بہلایا

۱۹۴۲

کیفِ انتظار

کیوں فراموش ہو وہ گوشۂ گلشن مجھ کو
جس کے سایوں میں تمناؤں نے انگڑائی لی

ایک گوشے میں وہ نرگس کی غنودہ آنکھیں
جن سے سوئے ہوئے احساس نے بینائی لی

دور وہ شہر سے اٹھتا ہوا موہوم سا شور
جس سے افکارِ زبوں حال نے گہرائی لی

دل کی دھڑکن پہ تھا پیہم تری آہٹ کا گماں
پتہ گرتا تھا تو جذبات مچل جاتے تھے

ترے ملبوس کی آتی تھی ہواہیں خوشبو،
اور غنچے تری آنکھوں میں بدل جاتے تھے

یک بیک عرش کو چھوتے ہوئے افکار مرے
ناامیدی کی گپھاؤں میں پھسل جاتے تھے

راستہ دیکھتے رہنے میں وہ لذت پائی
جو ترے حسن کے دیدارِ مسلسل میں نہیں

ان دنوں دل کو میسر تھا وہ سوزِ پر کیف
تیری زلفوں کے جو اٹے ہوئے بادل میں نہیں

اب یہ محسوس ہوا ہے کہ محبت کا خمار
ظلمتِ راہ میں ہے تابشِ مشعل میں نہیں

۱۹۴۲ء

کون؟

کائناتِ دل میں یہ گاتا ہوا کون آگیا
ہر طرف تارے سے برساتا ہوا کون آگیا

چار جانب پھول بکھراتا ہوا کون آگیا
میرے صحراؤں کو مہکاتا ہوا کون آگیا

یہ مجھے نیندوں سے چونکاتا ہوا کون آگیا

میٹھی میٹھی آگ احساسات میں جلنے لگی
روح پر لپٹی ہوئی زنجیرِ غم گلنے لگی

زندگی کی شاخِ مردہ پھولنے پھلنے لگی
نکہتوں سے چور شرمیلی ہوا چلنے لگی

دہر کو مستی میں نہلاتا ہوا کون آگیا

ذرہ ہائے خاک تاروں کی خبر لانے لگے
آسمانوں پر دھنک کے رنگ لہرانے لگے

نخل اپنی شانِ رعنائی پہ اترانے لگے
سرو جھونکے ڈالیوں کے ساز پر گانے لگے

قلبِ عالم کو یہ تڑپاتا ہوا کون آگیا

زندگی کی تلخیاں اک خواب ہو کر رہ گئیں
شوق کی گہرائیاں پایاب ہو کر رہ گئیں

کالی راتیں روکشِ مہتاب ہو کر رہ گئیں
سست نبضیں رعشۂ سیماب ہو کر رہ گئیں

برق کی مانند لہراتا ہوا کون آگیا

جلال و جمال

چن لئے کس نے مری پلکوں سے اشکوں کے شرار
کس نے اپنے قلب سے بھینچا ہے میرا قلبِ زار

چھٹ گئے جذبات پر چھائے ہوئے گہرے غبار
مڑ گئی افکار میں چبھتی ہوئی اک نوکِ خار

بیتی گھڑیوں کو یہ لوٹاتا ہوا کون آ گیا

جو کبھی تاروں میں جا کر جھلملایا، وہ نہ ہو
جو کبھی پھولوں میں چھپ کر مسکرایا، وہ نہ ہو

دور رہ کر بھی جو رگ رگ میں سمایا، وہ نہ ہو
جو مرے اب تک بلانے پر نہ آیا، وہ نہ ہو

یہ لجاتا، رکتا، بل کھاتا ہوا کون آ گیا،

یہ تو خود میرے تصور کا ہے اک عکسِ جمیل
یہ تو دل کی دھڑکنوں میں ہو رہی ہے قال و قیل

آہ لیکن یہ رُخِ پُر نور، یہ چشمِ کحیل
لڑکھڑاتی چال میں پنہاں خرامِ رودِ نیل

آئینہ سا مجھ کو دکھلاتا ہوا کون آ گیا

۱۹۴۲ء

بازدید

اس کی رفتار کا پہلے تو یہ انداز نہ تھا
اب تو ہر گام پہ ناگن سی بنی جاتی ہے

مرمریں ٹخنوں پہ یہ نقرئی جھانجھن کی چھنک
جس طرح نیند میں خوابوں کی پری گاتی ہے

بانہیں ہلتی ہیں کہ میخانے کے در کھلتے ہیں
یہ قدم دھرتی ہے یا جام سے چھلکاتی ہے

اسی دنیا میں ہے نظارہ فردوس نصیب
مجھ کو واعظ کی امیدوں پہ ہنسی آتی ہے

کپکپاتے ہیں صبا کے متر نم جھونکے
جانے اس وقت یہ کیوں آئی ہے بھرنے پانی

ایسے موسم میں یہ ملبوس ہے وحشت کی دلیل
کالے آنچل سے جھلکتی ہے کھلی پیشانی

ٹھنڈ سے گرچہ ہوا لال بھبھوکا چہرہ
ہے نگاہوں میں مگر دبدبہ سلطانی

ایک پر پیچ بگولا سا نظر آتی ہے
کس نے معصوم جوانی کو کیا طوفانی

کیوں نہ میں بڑھ کے ذرا پوچھ لوں "دولہا" کا مزاج
لیکن اس کو مری باتوں سے حجاب آئے گا

پھر بھڑک اٹھیں گے ماضی کے سیہ پوش چراغ
نیم وا آنکھوں میں ہلکا سا عتاب آئے گا

یاد آئیں گے اسے پھر وہ سہانے لمحے
پھر نظر اس کو وہ الجھا ہوا خواب آئے گا

چھوڑ کر راہ پلٹ جائے گی وہ پنگھٹ سے
یوں "مسافر" کی محبت کا جواب آئے گا

۱۹۴۲ء

جب آنکھ کھلی تو کیا دیکھا

جو بیتی وہ بیتی، آخر بیتی پہ کیوں روؤں میں
تار تار ہے دامن سارا اب دامن کیا دھوؤں میں
کوڑی مول بکے جب موتی، کیسے ہار پروؤں میں
ساتھ دیا کانٹوں نے میرا پھولوں پہ کیوں سوؤں میں
مانگ کے تاروں سے من کا اجیالا کیوں کھوؤں میں

سُونی سی پگڈنڈی پہ مڈبھیڑ ہوئی تھی اِک جگ بیتا
چہرے پہ وہ ہالا جیسے چاند کی کرنوں میں گیتا
چال ایسی لچکیلی جیسے بن میں لہرائے چیتا
نئی نویلی اس کے پیراہن آخر کب تک سیتا
پلکوں نے گالوں کو چوما۔ میں نے جانا، رن جیتا

چرنوں کو چھو کر پوچھا — تو کس نگری کی رانی ہے؟
کس نگری سے آئی ہے تو؟ کس نگری کی ٹھانی ہے؟
کیا تیری نگری بھی اس نگری سی آنی جانی ہے؟

میری زباں پتھر بن جائے — پر کیا تو بھی فانی ہے؟

تیرے چہرے کی لَو سے تو چاند بھی پانی پانی ہے"

یہ کہہ کر جب اوپر دیکھا، سائے ہنسی اڑاتے تھے

دھرتی تھر تھر کانپ رہی تھی، ہچکولے سے آتے تھے

پیڑ ہوائیں جھوم جھوم کر بھتنے سے بن جاتے تھے

دور گھنے جنگل میں چھپ کر دو گیدڑ چلاتے تھے

اور ستارے انگاروں کے چھالے سے برساتے تھے

میں کیا جانوں یہ سپنا تھا یا ہونی کا سایا تھا

برسوں سلگ سلگ کر میں نے من کا دیا جلایا تھا

اپنے لہو سے پالے پو سے گیتوں کا پھل پایا تھا

پریم مندر کا ٹھکا پروہت پھولے نہیں سمایا تھا

کچی پکی نیندوں کو چرانے کیا جانوں کون آیا تھا

آئی گئی باتوں کے جھگڑے، پگلے کون مٹاتا ہے

اک راجہ آکاش پہ بیٹھا اپنا من پرچاتا ہے

جب چاہے چپکے سے اک گڑیا کا پیچ گھماتا ہے

گڑیا سر دھنتی جاتی ہے، وہ مسکاتا جاتا ہے

سپنوں کی پرچھائیں بنا کر انساں کو بہکاتا ہے

راجہ جی! میری باتوں کا بُرا نہ مانو، مت جاؤ

جی میں آئے تو پریوں کے اور ہیولے بنواؤ

ایک کھلونے کی کیا ہستی، کھیلو، من کو پرچاؤ

لیکن اس گستاخ کوی سے اک سچائی سن جاؤ

انساں باغی ہو جاتے ہیں جب ٹپکیں من کے گھاؤ

۱۹۴۳ء

جُدائی کی پہلی رات

نہ جانے آج کی شب اس قدر طویل ہے کیوں؟

نحیف چاند جہاں سے چلا تھا، رُک سا گیا
کسی خیال میں یوں کھو گیا، کہ جھک سا گیا

ستارے جم سے گئے سرمئی خلاؤں میں
گھلی ہیں نیند کی انگڑائیاں ہواؤں میں

افق پہ شام کو جو ابر گنگنایا تھا
فقط امید کو بیدار کرنے آیا تھا

ندی کے موڑ پہ لہروں میں گونج بھی نہ رہی
بلند نیم کی شاخوں میں بیکلی نہ رہی

فضا پہ موت کی افسردگی ہے چھائی ہوئی
غنودگی سی نظاروں میں ہے سمائی ہوئی

جدھر نگاہ اٹھے، انجماد طاری ہے
سکوت، ذوقِ سماعت پہ کتنا بھاری ہے

لپیٹ کر مرے احساس کو دھندلکوں میں
یہ کون بیٹھا ہے افکار کے محلکوں میں

یہ کس نے وقت کے پر نوچ کر بکھیر دیئے
یہ کس نے رُخ ہی لپکتے پلوں کے پھیر دیئے

نہ کٹ سکی اگر اک رات بھی جدائی کی
تو کون چھانے گا پہنائیاں جدائی کی

نہ چاند ڈوبتا ہے اور نہ تارے ٹوٹتے ہیں
نہ سمتِ شرق سے انوارِ صبح پھوٹتے ہیں

نہ جاگنے کی ہوس ہے، نہ نیند آتی ہے
بس اک خلش سی خیالوں میں سرسراتی ہے

نہ جانے آج کی شب اس قدر طویل ہے کیوں!

۱۹۴۳ء

رات کی بات

میرے خوابوں کے دریچوں سے یہ کس نے جھانکا
نیند کی جھیل پہ یہ کس نے کنول پھیلائے
لال پوروں میں یہ آنچل کا کنارا تھامے
کس نے پائل کے مدھر تال پہ دوہے گائے

سوئی سوئی سی یہ آنکھیں ہیں ادھورے سپنے
خلوتِ دل میں چھپا رکھتے ہیں جن کو فنکار
مرمریں گالوں پہ مدھم سے شفق رنگ دیئے
جو چمکتے ہیں خیالوں کی ندی کے اس پار

وہی سنجیدہ سا اک لوچ ہے ہنگامِ خرام
جیسے بھٹکی ہوئی ساون کی اکیلی بدلی
رخِ رنگیں پہ وہ ہلکا سا تفکر، جیسے
نیلی لہروں میں نظر آتی ہے گدلی گدلی

ان گنت نظروں سے بچتی ہوئی تو آئی ہے
اپنے ٹھکرائے ہوئے دوست کا جی بہلانے
وہی عنواں ہیں کمانوں سی بھووں میں مستور
مجھ سے جن پہ ابھی لکھے نہ گئے افسانے

انگلیوں میں وہ ستاروں کی تپاں بے چینی مسکراہٹ میں گجردم کی خنک رعنائی
کالے بالوں میں وہ موہوم سنہری لہریں جیسے جلتے ہوئے جنگل میں چلے پروائی

ہائے وہ لمس، وہ اک گونج، وہ اک واویلا وہ دھندلکوں میں پگھلتے ہوئے پتلے سائے
وادیٔ خواب میں وہ صرصرِ دنیائے شعور جیسے بھرپور بہاروں میں خزاں آجائے

دھجیاں بن کے اڑا رات کا پیراہنِ تار تارے ٹکرائے خلاؤں میں، فضا چکرائی
میٹھی نیندوں کو کترتی ہوئی کرنیں لپکیں
خون کا طشت لئے صبح کی دیوی آئی

۱۹۴۴ء

سراب

کس نے مدہوش نظاروں سے پکارا تھا مجھے

میں، کہ خلوت کے حجابوں میں مگن رہتا تھا
علم و حکمت کی شرابوں میں مگن رہتا تھا
حشمت و جاہ کے خوابوں میں مگن رہتا تھا

کس نے فطرت سے بغاوت پہ ابھارا تھا مجھے

شور اٹھا میرے افکار کے ایوانوں میں

خمِ محراب میں اک دائرہ باہوں کا بنا
چشمِ فانوس میں اک جال نگاہوں کا بنا
سطحِ احساس پہ اک باغ گناہوں کا بنا

کچھ حقیقت سی جھلکنے لگی افسانوں میں

میں ادھر جھوم کے پلٹا، تو ادھر گھوم گیا

گاہ سایوں میں چلا، گاہ لبادہ بدلا
ایک دربار میں پہنچا تھا۔ کہ جادہ بدلا

جلال و جمال

تھک کے اس سمت سدھارا۔ تو ارادہ بدلا

رند بننے کے لئے آیا تھا معصوم گیا

اب نہ رفعت کی تمنا ہے، نہ پستی کا گلہ

لیکن احساس کا گلزار خزاں دیدہ ہے

منزلیں دور ہیں اور راستہ پیچیدہ ہے

جو ورق ذہن کا الٹوں وہی ژولیدہ ہے

اپنی فطرت سے بغاوت کا یہ انعام ملا

اپنی خلوت کا جہنم ہی گوارا تھا مجھے

میں نے فردوس میں کانٹوں کے سوا کیا پایا

چند موہوم حسیناؤں کا دھوکا کھایا

چاپ سنتا رہا۔ پر کون گیا۔ کون آیا

کس نے مدہوش نظاروں سے پکارا تھا مجھے

۱۹۴۴ء

دن ڈھلے

اور کس دھن میں محبت کا ترانہ چھیڑوں

وہی پلٹے، وہی تانیں، وہی زیر و بم ہیں
جن کو ماضی کے مزاروں سے اٹھا لایا ہوں
وہی بجتے ہوئے الفاظ، کھنکتے ہوئے بول
جن کو یادوں کے دھندلکوں سے بلا لایا ہوں

وہی آغاز۔ ترے بال، ترے لب، ترے گال
وہی انجام۔ ترا سحر، ترا مَس، ترا رس
مری آواز وہی ہے، مرا انداز وہی
ایک نغمہ ہے سراپا، مری رگ رگ نس نس

گیت بدلا ہے نہ گت بدلی ہے میں نے لیکن
تجھ کو ایام کی گردش نے بدل ڈالا ہے
اب نہ وہ رنگ ہیں گالوں میں، نہ رَو بالوں میں
اب فقط میرا تصور ترا رکھوالا ہے

انقلابات سے آزاد رہی فطرتِ عشق
حسن بدلا۔ مگر احساس سے محروم رہا
اس تغیّر کا ہدف ایک تری ذات نہیں
زہرہ فاموں کا ازل سے یہی مقسوم رہا

عشق کا ساز شکستہ نہیں ہونے پاتا اس کے ہر تار سے صرف ایک صدا آتی ہے
یہ صدا — زخمہ زنِ عرش کے دل کی دھڑکن جس کی عصمت کی مشیّت بھی قسم کھاتی ہے
اور کس دُھن میں محبت کا ترانہ چھیڑوں

۱۹۴۶ء

ترکِ محبت کے بعد

غیر کی ہو کے بھی تم میری محبت چاہو
اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں یہ تارے کیسے!

فرش پر جس کو ابھی تک نہ ملی جائے پناہ
عرش سے چاند کا ایوان اتارے کیسے!

جس کی راہوں پہ بھٹکتے ہوئے جگ بیتے ہیں
پھر اسی دشت کو بدبخت سدھارے کیسے!

قافلے آئے، گئے، گرد اٹھی، بیٹھ گئی،
اب مسافر کو افق پر سے اشارے کیسے!

جن کی تقدیر میں تھا دامنِ گلچیں کا مزار
وہ شگوفے تو پرائے ہیں، ہمارے کیسے!

پیش کر سکتا ہوں لیکن تجھے بہلانے کو
چاندنی رات میں مچلے ہوئے رومان کی یاد

بیدِ مجنوں کے طلسمات سے پل پل چھنتی
آسمانوں کو لپکتی ہوئی اک تان کی یاد

میری وارفتگیٔ شوق کی سن کر روداد
تیری آنکھوں میں دمکتے ہوئے ارمان کی یاد

دونوں چہروں پہ شفق، دونوں جبینوں پہ عرق
دونوں سینوں میں دھڑکتے ہوئے ہیجان کی یاد

"کون ہیں آپ؟" "مری زیست کے تنہا ساتھی"
پہلی پہچان کی یاد — آخری پیمان کی یاد

۱۹۴۶ء

لمحاتِ گریزاں

میں ابھی وقت کو پابندِ سلاسل کر لوں
یہ خلاؤں میں لپکتی ہوئی کافر گھڑیاں
چاند رک جائے، ستاروں کے سفینے تھم جائیں
دم بخود ہو کے ہواؤں کی ندی میں جم جائیں

یہ صنوبر کا سبک اور چھریرا سایہ
اور یہ لمحہ، جوانی کا گریزاں لمحہ
آتشیں رنگ چٹانوں سے لپٹ کر سو جائے
اتنا پھیلے کہ مجسم ابدیت ہو جائے

یہی جھرنے کا حسیں موڑ نگاہوں میں رہے
یہی معصوم ترنم، یہی پربت کا سکوت
یہی پھولوں سے لدی بیل، یہی چھتنارا
یہی ہالا مری باہوں کا، یہی مہ پارا

یہی بھیگے ہوئے ہونٹوں کی گلابی قوسیں
یہی آنکھوں میں دمکتا ہوا بھرپور شباب
یہی عارض، یہی چہرے کا مدوّر مرمر
اور یہی جسم، یہی کعبۂ احساس و نظر

آخر انساں ہوں، مشیت سے الجھنے والا
جس کی پرواز میں خود خلوتِ یزداں ہے محیط
اوج افلاک کے اسرار کا غماز ہوں میں
وہ دھندلکوں سے الجھتا ہوا شہباز ہوں میں

لیکن اک بات ۔ محبت کے تقاضوں سے الگ — اپنا انجام نہ بن جائے یہی ٹھہراؤ
اور وہ جبرِ مسلسل — وہ جمودِ ابدی ابنِ آدم کے کلیجے کا پرانا گھاؤ

شام کو کتنا دلآویز تھا سورج کا غروب لیکن اب صبح کا محتاج ہے یہ نظارا
کیا عجب، وقت ہمیں پھر بھی مہیّا کر دے
یہی پھولوں سے لدی بیل، یہی چھتنارا

۱۹۴۶ء

یادش بخیر

محبت کے شبستاں آج بھی جس سے درخشاں ہیں
وہ اک بے اختیارانہ و بے محابا مسکراہٹ تھی

وہ ہر آواز میں اک گدگدی سی، اک تقاضا سا
یہ دل کی دھڑکنیں تھیں یا ترے قدموں کی آہٹ تھی

ابھی تک چونک چونک اٹھتا ہوں راتوں کی خموشی میں
ترے ملبوس میں گاتی بلاتی سرسراہٹ تھی

تری پہلی نظر میں بجلیوں کا سا قرینہ تھا
کماں کی سی لچک تھی، تیر کی سی سنسناہٹ تھی

ستاروں میں رچی، دل میں سمائی، برق میں کوندی
مری آغوش میں جو تیری پہلی تلملاہٹ تھی

امیدوں کے چمن میں دیر تک جاری رہے نغمے
کلی چٹکی تھی یا دوشیزگی کی کسمساہٹ تھی

ترے گیتوں میں احساسِ جوانی جھمجھماتا تھا
رواں پانی میں بہتی چاندنی کی لپلپاہٹ تھی

وہ تیرے بے سبب رونے سے عارض کا دہک اُٹھنا
میں سمجھا برگِ گل پر شبنموں کی کپکپاہٹ تھی

مگر یہ ذکر ہے اُس دور کا جب تیری سانسوں میں
سحر کی اولیں انگڑائیوں کی تھرتھراہٹ تھی

۱۹۴۶ء

سامنا

نقرئی چاند نے پیپل کی گھنی شاخوں میں
اپنی کرنوں کے لپکتے ہوئے تار الجھائے
جھیل کی سطح پہ یوں لوٹ رہی ہیں لہریں
جیسے راہی کو جماہی پہ جماہی آئے
سرسراتی ہے کچھ اس طرح ببولوں میں ہوا
کانکن کان کے پاتال میں جیسے گائے

میرے بچھڑے ہوئے محبوب، قریب آجاؤ
میں وہی ہوں، مری حالت سے نہ دھوکا کھاؤ
خاک آلودہ جبیں پر مری، تارے چھڑکو
میری جلتی ہوئی آنکھوں میں شفق ٹپکاؤ
آؤ، آؤ میرے دیرینہ و تنہا ساتھی
مرے آئینۂ ماضی کی جِلا بن جاؤ

جسم؟ میں جسم کا بھوکا ہوں؟ مجھے جسم سے کیا!
مجھ کو معلوم ہے اِس کانچ کے سپنے کا مآل،
ہونٹ بے رس ہیں۔ چمک جوبن کی بے مایہ ہے
گال بے رنگ ہیں۔ فانی ہے جوانی کا گلال،
تم تو بالوں کو بکھیرے ہی چلے جاتے ہو
اسی ظلمت میں ہے خورشیدِ محبت کا زوال

عشق کی تان، ٹھہر نا تو، کہاں ٹوٹے گی!
میرے کانوں میں بھی شاید کوئی آواز آئے
سازِ تقدیس کے تارو، کوئی نغمہ، کوئی دُھن!—
کیسی چپ چاپ ہے— اب کوئی نہ آنے پائے—
نقرئی چاند نے بیلی کی گھنی شاخوں میں
اپنی کرنوں کے لپکتے ہوئے تار الجھائے

۱۹۴۶ء

تارے

کوئی شکوہ نہیں تقدیر کی ناسازگاری کا
دماغ اونچا ہے تاروں سے بھی میری خاکساری کا

اُس کے آنے میں اُدھر دیر ہوئی جاتی ہے
ساری دنیا اِدھر اندھیر ہوئی جاتی ہے

یہ گھنی پلکوں کے سائے ہیں ترے رخسار پر
چھا رہی ہے یا گھٹا ساون کی شالامار پر

اندھیری رات میں مشعل کا کام دیتا ہے
مری جبیں پہ رہے تیری بندگی کا داغ

اُبلے جلتی ہیں وہ تپتے ہوئے ویرانوں میں
قصرِ مرمر میں جنہیں رقص کناں ہونا تھا

جلال و جمال

جل رہے ہیں ترے عارض ہیں جوانی کے دیئے
سُست کیوں ہے ترا اندازِ خرام اے ساقی

کہاں سے اُٹھی اور کدھر جائے گی
نہیں پوچھتے خاک سے شہ سوار

وفورِ کیف میں یوں انگلیاں تاروں پہ ناچی ہیں
پڑا ہے ہر طرف بکھرا ہوا سازِ شبستانی

تم ایک بار اپنی تجلّی دکھا تو جاؤ
شاید نہ ختم ہو مری مجبوریوں کی رات

یوں تو عالم ترے اعجاز کے گن گاتا ہے
بخیہ گر ڈال مرے چاکِ جگر پر بھی نظر
السلام اے مرے محبوب، مرے حجلہ نشیں
"پردہ از چہرہ برافگن کہ چو خورشیدِ سحر
بہرِ دیدارِ تو لبریزِ نگاہ آمدہ ایم"
اقبال

یہ بھی کوئی زندگی ہے، ہو کے نومیدِ نشاط
زندگی کے پیچ و خم میں رائگاں ہو جائیں ہم

میرے دن تیرے، مری راتیں تری
مہرِ رخشاں، ماہِ تاباں کی قسم

ترے غرور کے معیار سے بلند ہوں میں
تری پسند کا کیا ذکر، خود پسند ہوں میں

ابھی امید مرا چاکِ جگر سیتی ہے،
خواب کی بات نہیں مجھ پہ یونہی بیتی ہے

ہدف بننے کی خاطر کہکشاں دامن بڑھاتی تھی
کچھ اس شدّت سے کھینچی تھی محبت کی کماں میں نے

(۳)

ہر غنچے کا گُل ہونا آغوش کشائی ہے!

غالب

اَن دیکھا محبوب

گھنی شاخوں میں چھپ کر جب کوئی چڑیا چہکتی ہے — تو میرے دل میں کیوں حسرت کی چنگاری بھڑکتی ہے

حسیں چوپائے جب چرنے کو نکلیں سبزہ زاروں میں — تو میں کیا ڈھونڈھتا رہتا ہوں سنجیدہ نظاروں میں

سحر کے وقت جب پنہاریاں پنگھٹ پہ آتی ہیں — گلابی گاگروں کے تال پر تالی بجاتی ہیں

تو میں اجڑے ہوئے محلوں میں کس کی دھن میں جاتا ہوں — شکستہ بام و در کو کس کی خاطر چوم آتا ہوں

معاً جب ٹوٹتی راتوں میں کوئل کوک اٹھتی ہے — تو میرے دل میں کیوں موہوم سی اک ہوک اٹھتی ہے

خنک راتوں میں جب تارے فلک پر ٹمٹماتے ہیں — مجھے کس پیکرِ زہرہ جبیں کے خواب آتے ہیں

یہ آنکھیں کون جھپکاتا ہے رہ رہ کر ستاروں میں — یہ کس کا عکس پڑتا ہے شفق کے لالہ زاروں میں

گلابی سیپیوں میں وہ گہر بن کر چمکتا ہے — گلستاں میں گلاب و نسترن بن کر مہکتا ہے

کبھی فانوسِ کافوری میں چھپ کر جگمگاتا ہے — کبھی ویران کھیتوں پہ گھٹائیں بن کے چھاتا ہے

کبھی پُرخوف جنگلوں میں، کبھی پُرامن شہروں میں — کبھی اڑتے ہوئے آنچل کی بے ترتیب لہروں میں

کبھی محتاج دوشیزاؤں کی بوسیدہ جھولی میں — کبھی بچوں کی ٹوٹی، توتلی معصوم بولی میں

کبھی مغموم آنکھوں میں، کبھی روشن چراغوں میں — کبھی جامِ سفالیں میں، کبھی لبریز ایاغوں میں

نشہ بن کر مرے خوابوں پہ کوئی چھائے جاتا ہے
جدھر دیکھوں اُدھر مبہم اشاروں سے بلاتا ہے

۱۹۳۸ء

میرا گاؤں

رہوں گا اپنے وطن کے بہشت زاروں میں
جوان وادیوں، بلوان کوہساروں میں

یہ کچے مٹی کے گھر، یہ غریب رشتہ دار
یہ آڑھی ترچھی سی بوسیدہ چھپروں کی قطار

صبیح بچوں کے جمگھٹ یہ تنگ گلیوں میں
یہ پھول بننے کے انداز تازہ کلیوں میں

یہ منہ اندھیرے ہی بیلوں کی گھنٹیوں کی صدا
یہ صبح صبح گھروں سے دھواں سا اٹھتا ہوا

یہ چھت پہ بیٹھی ہوئی بھولی بھالی دوشیزہ
یہ بانکا ترچھا سا اک نوجوان جاتا ہوا

یہ اُونچے اُونچے درختوں کی چھدری چھدری چھاؤں
افق پہ بکھرے ہوئے بےشمار ننھے گاؤں

یہ سرد راتوں میں چوپال پر سلونے گیت
یہ حادثات کا اظہار، جبر و شکر کی ریت

یہ پتھروں پہ تھرکتا ہوا حسیں نالا
کنارے بیٹھا ہوا کھیتیوں کا رکھوالا

مقابلے یہ کبڈی کے، نوجوانوں میں
شکست و فتح کا اظہار چند گانوں میں

یہ سیدھے سادے عقیدے یہ بھولے بھالے خیال
ہوس سے پاک جوانی۔ ہوس سے پاک جمال

ندیم شہر سے اکتا چکی ہے طبع حزیں
یہیں کہیں ہے مرے شوق کی بہشت بریں

۱۹۳۸ء

گاؤں کی صبح

مشرق کے چھلکتے ساغر میں سورج کی شعاعیں تیرتی ہیں
مغرب میں افق کے سینے پر بدمست گھٹائیں تیرتی ہیں

چڑیوں کے لشکر کھیتوں کی وسعت میں چہکتے جاتے ہیں
مسجد کے مقدس مینارے کرنوں سے دمکتے جاتے ہیں

گلیوں سے صدائیں آتی ہیں ننھے بچوں کے رونے کی
اور گونج رہی ہیں ہر جانب آوازیں دودھ بلونے کی

لاٹھی کو جما کر کاندھے پر گھر سے نکلا ہے چرواہا
گلّے کے گذرتے ہی جانے کیا سوچ رہا ہے چرواہا

پنہاریاں پنگھٹ کی جانب تیزی سے تھرکتی جاتی ہیں
اور ہولے ہولے اوڑھنیاں سینوں سے سرکتی جاتی ہیں

اک تنگ گلی میں کھلتے ہیں دروازے چند دکانوں کے
قسمت کے نوشتے رکھے ہیں ان میں مفلس دہقانوں کے

چوپال پہ رونق ہے۔ شاید تھانے کے سپاہی آئے ہیں
مقروض غریب کسانوں کے وارنٹ بنا کر لائے ہیں
وہ اک بوسیدہ کٹیا سے فریادوں کا طوفان اُٹھا
تھانے کی طرف جانے کے لئے اک خستہ دل دہقان اٹھا
نالوں کی اک گھنگھور گھٹا ہر سمت فضا پر چھائی ہے
آنکھوں سے شرارے برساتی۔ وہ صبح کی دیوی آئی ہے

۱۹۳۸ء

ساون

وہ پربت پر ہے اک بدلی کا سایا　　اندھیرا جنگلوں میں سنسنایا،
پپیہا پیہو پیہو گنگنایا،　　ہوا نے جھاڑیوں میں گیت گایا

وہ بگلوں نے بھی اپنے پر سنوارے
وہ مکھن کے کھلونے پیارے پیارے

وہ وادی میں ابابیلوں کی ڈاریں　　وہ بل کھاتی ہوئی پانی کی دھاریں
وہ بھولے بھولے بچوں کی قطاریں　　وہ جھرنوں پر ملاروں کی پکاریں

وہ اک ننھی پھسل کر رو رہی ہے
چنریا بے دلی سے دھو رہی ہے

دھنک نے یک بیک چلّہ چڑھایا　　پلٹ دی آن میں عالم کی کایا
پھٹی بدلی میں سورج مسکرایا　　چھوا چاندی کو اور سونا بنایا

بلندی پر وہ جنگل لہلہائے
پہاڑوں کے پڑے جھیلوں میں سائے

وہ اک چرواہے نے مرلی بجائی   وہ نظاروں کو انگڑائی سی آئی
یہ خنکی اور یہ آتش نوائی   نیا چولا بدلتی ہے خدائی

فضا ٹھٹھری ہوئی تھی کھل رہی ہے
گلے جھاڑی سے جھاڑی مل رہی ہے

یہ سبزہ اور یہ نالوں کی روانی   بپھر کر جھاگ بن جاتا ہے پانی
یہ بھیگے بھیگے پودوں کی جوانی   مجھے ڈستی ہیں یہ گھڑیاں سہانی

زمیں پر بارشیں کب ہو رہی ہیں
مری قسمت کی پریاں رو رہی ہیں

وہ اب تک کیوں نہ آئے ! کیوں نہ آئے !   وہ آئیں تو مجھے ساون لبھائے
مجھے وہ، اور انہیں پردیس بھائے   کہاں تک راہ دیکھوں، ہائے ہائے

اُڑے جاتے ہیں وہ بادل برس کر
ندیمؔ۔ اب مسکرا، کمبخت بس کر

۱۹۳۹ء

مادرِ فطرت

دُور پربت پر ہیں طوفانی گھٹائیں خیمہ زن

ندیاں ناگن سے بل کھاتی رواں ہیں جا بجا
آ رہی ہے ہر طرف سے بھوری چڑیوں کی صدا
جھاڑیوں پر تازگی ہے، کونپلوں پر بانکپن

بدلیوں کی آڑ سے نکلی وہ اک چنچل کرن

دھل گئے ہیں اک سنہرے نور سے ارض و سما
آنکھ مل کر جاگ اٹھا ہے سکوں زارِ فنا
آبشاروں میں ہیں سورج کی شعاعیں شعلہ زن

ان مقدس جلوہ زاروں پر مرے نغمے نثار

دہر کے آلام سے جب تنگ آجاتا ہوں میں
مادرِ فطرت کے پہلو میں سکوں پاتا ہوں میں
پھول بن جاتے ہیں سینے میں محبت کے شرار

جب حسیں محلوں کی تنہائی ڈراتی ہے مجھے
سرد چشموں کے کنارے نیند آتی ہے مجھے

۱۹۴۰ء

گاؤں کی شام

دھندلکے پربتوں پر چھا رہے ہیں
اجالے کے کنول کملا رہے ہیں

گپھاؤں میں کئی بانکے گڈریے
جوانی کے ترانے گا رہے ہیں

اندھیری کھوہ میں بھیڑوں کے ریوڑ
ٹھٹھر کر ٹھنڈ سے ممیا رہے ہیں

ہواؤں کو پروں سے تھپتھپاتے
پرندے گھونسلوں کو جا رہے ہیں

دھواں سا گاؤں پر پھیلا ہوا ہے
نظر سے کھیت چھپتے جا رہے ہیں

افق کے پاس تارے اِکّا دُکّا
اندھیرے سے اُبلتے آ رہے ہیں

معطّر وادیوں کے نرم جھونکے
فرازِ کوہ کو مہکا رہے ہیں

کہیں کوئل دما دم کوکتی ہے
کہیں ٹڈّے بہم چلّا رہے ہیں

وہ لہراتی ہوئی پگڈنڈیوں پر
مسافر سر جھکائے جا رہے ہیں

مسافر؟ — اے نگاہِ بادہ آشام
یہ تجھ پر نشے سے کیا چھا رہے ہیں

انہیں بیگار میں پکڑا گیا ہے
یہ سب تھانے کی جانب جا رہے ہیں

۱۹۴۰ء

مرغزار و جوئبار

ہائے وہ معصوم قریے کوہساروں کے قریب
اُف وہ چرواہوں کے جمگھٹ مرغزاروں کے قریب

ہائے وہ دشتِ حسیں پر لہلہاتی دھوپ چھاؤں
اور وہ سورج کا ٹکڑا ابر پاروں کے قریب

مست رَو جھرنوں میں پَر دھوتی ہوئی چڑیوں کا شور
سرمدی نغموں کی گونجیں آبشاروں کے قریب

جنگلوں کے سرمئی پردوں میں گاتی کوئلیں
وہ پپیہوں کی پکاریں جوئباروں کے قریب

ہر طرف بکھرے ہوئے پھولوں میں طفلِ سادہ رُو
چاند جیسے مسکراتا ہے ستاروں کے قریب

ہائے وہ پریوں کے ایواں، ہائے وہ سیمیں کنول
جھیل سے چمٹے ہوئے لرزاں نظاروں کے قریب

چارسو ترشی ہوئی سبزے کی پیاری کیاریاں
راہ پر گنجان نیموں کی قطاروں کے قریب

نوجوان دہقاں کا وہ پربت پہ بے مقصد سفر
اک سبک پیکر خراماں سبزہ زاروں کے قریب

کاش اک دن پھر مجھے میرا مقدر کھینچ لے
اِن "بہشتوں" سے پرے اُن "نُنّہ زاروں" کے قریب

۱۹۴۲ء

شہپارہ

ہنوز چہرۂ ہستی میں رنگ باقی ہے

فرازِ کوہ کی سنجیدگی کی مجھ کو قسم

پہاڑی نالوں کی پیچیدگی کی مجھ کو قسم

ہنوز آدم و فطرت میں جنگ باقی ہے

سمندروں کی ہیں جولانیاں گواہ مری

میں دیکھتا ہوں کہ صحرائے بیکراں ہے وہی

غنودہ وسعتوں پر خواب کا سماں ہے وہی

رُخِ خرد کی ہیں حیرانیاں گواہ مری

ہنوز اوس کے موتی ہیں برگِ گل پہ نثار

بچھی ہوئی ہے بساطِ زمردیں اب تک

نگاہِ شوق ٹھہرتی نہیں کہیں اب تک

ہنوز روحِ مشیت ہے بے نیازِ قرار

وہ نقش، کلکِ ازل نے جسے ابھارا ہے

ہنوز میری نگاہوں میں شاہ پارا ہے

۱۹۴۳ء

چرواہے

وہ بانکے ترچھے چرواہے — یوں پھرتے ہیں میدانوں میں
جیسے رنگیلی تیتریاں — منڈلاتی ہیں بستانوں میں
کہساروں میں لہراتے ہیں، — دَرّاتے ہیں ویرانوں میں
موسم کے ارادے تولتے ہیں — پُروائی کی میزانوں میں
انگور کی لذت پاتے ہیں، — مکی کے مہکتے دانوں میں
دن بھر کی تھکی ہاری چڑیاں — جب آتی ہیں کاشانوں میں
یہ اپنا جی بہلاتے ہیں، — پریوں کے حسیں افسانوں میں
صدیوں سے اجڈ کہلاتے ہیں — فیشن کے غلام انسانوں میں
لیکن یہ ان سے بڑھ کر ہیں — مضبوط اپنے ایمانوں میں
رکھتے نہیں اپنی مورتیاں — تہذیبوں کے بُت خانوں میں
تاریخ مرتب کرتے ہیں — کھیتوں میں اور کھلیانوں میں

جب تک یہ گڈریے جیتے ہیں
گیتی کے گریباں سیتے ہیں

۱۹۴۰ء

مناظر

یہ ریت کے ذرّے ہیں کہ الماس کے ٹکڑے
گیتی نے اُگل ڈالے ہیں غاروں کے دفینے

•

یہ طلوعِ صبح کے آثار آتے ہیں نظر
یا دعاؤں کے لئے وا ہیں فلک کے بام و در

•

ڈار قازوں کی کہستاں سے کماں بن کر اُڑی
جانے کیوں کہرے میں کرلاتی ہوئی گم ہو گئی

•

ایک تارہ نور کی اک لہر بن کر بہہ گیا
جانے دل رُکنے کی دھن میں کیوں دھڑکتا رہ گیا

•

تاریکیوں میں دب کے لرزتا ہے بار بار
پچھم کے پربتوں پہ شفق کا مہین تارہ

•

برف گرتی ہے جوانی کے خیالوں کی طرح
دودھیا رُوئی کے دھنکے ہوئے گالوں کی طرح

(۴)

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس
حرّیت از عفّتِ فکر است و بس

(مسافر)

آج اور کل

کل تو جب آئے گا دیکھا جائے گا — آج جب جائے گا پھر کب آئے گا
آج کچھ کر لے تو کل کی فکر کر — آج تیری زندگی کی ہے سحر
آج سے کرتا ہے کسبِ فیض کل — کل کی خاطر آج ہی منزل سے چل
آج سے ہے زندگانی کو دوام — اور کل ہے آج کا اک اور نام

آج اگر بگڑا تو کل تاراج ہے
کل کی کنجی درحقیقت آج ہے

۱۹۳۷ء

عزمِ نو

عالم کو سوزِ عشق دکھانے لگا ہوں میں
اک بھولی بسری بات بتانے لگا ہوں میں

اب مجھ کو راہبر کی ضرورت نہیں رہی
اب اپنے آپ کو نظر آنے لگا ہوں میں

کیوں میرے قہقہوں کی حقیقت چھپی رہے
دنیا کو دل کے داغ دکھانے لگا ہوں میں

کانٹوں سے کھیلتا ہے مرا مضطرب شباب
آسائشوں کا نام مٹانے لگا ہوں میں

اپنے لہو سے چند شرارے نچوڑ کر
بجھتے ہوئے چراغ جلانے لگا ہوں میں

بوسیدہ ترکشوں میں سجا کر جدید تیر
چڑیوں کو کرگسوں سے لڑانے لگا ہوں میں

پر کٹ چکے تو کیا کہ طلب کے خلوص سے
انساں کو آسماں پہ بٹھانے لگا ہوں میں

۱۹۳۷ء

ستی

یہ بھڑکتا ہوا دوزخ، یہ لپکتے ہوئے شعلے، یہ دھڑکتے ہوئے سینے

یہ لرزتی ہوئی روحیں، یہ تڑپتی ہوئی نبضیں — یہ محبت کے دفینے

یہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو، یہ دمکتے ہوئے آنسو

یہ ڈھلکتے ہوئے آنسو ہیں کہ نیلم کی کٹوری میں ہیں مرمر کے نگینے

یہ لہکتے ہوئے آنچل، یہ کھسکتے ہوئے دامن، یہ سرکتے ہوئے فرغل

کہ سمندر کے کنارے پہ ہواؤں سے مچلتے ہیں زمرد کے سفینے

یہ پریشاں سی نگاہیں، یہ پشیماں سی نگاہیں، یہ ہراساں سی نگاہیں

یہ شکایت سی لبوں پر، یہ تعجب سا نظر میں، یہ جبینوں پہ پسینے

وہ بھڑکتے ہوئے ذہنوں میں دھماکا سا ہوا — ایک چمک سی ہوئی پیدا

وہ دہکتے ہوئے فردوس میں اک جست لگائی ہے خموشی سے کسی نے

وہ فرشتوں کی قطاریں سی شعاعوں کے سہارے سے زمیں پر اتر آئیں

وہ تھرکتے ہیں ستاروں سے پرے نور بھرے بحر میں روحوں کے سفینے

۱۹۳۷ء

روحوں کی انجمن

کلی کلی سے نسیم سرگوشیاں سی کرتی ہے جب چمن میں
مجھے تخیل پکار لیتا ہے چند روحوں کی انجمن میں

کسی کے اعضا کا لوچ نغمے کی کروٹوں سے بھی نرم و نازک
کسی کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ سی اور لرزش سی تن بدن میں

کسی کی شفاف و مرمریں انگلیوں پہ قطرے لہو کے لرزاں
ہزاروں اژدر سمٹ رہے ہیں کسی کے گیسوئے پر شکن میں

کسی کی پازیب کے چھناکوں سے مرتعش ہے نظامِ عالم
کوئی زمانے پہ جلوہ افشاں مہ و ستارہ کے پیرہن میں

کسی کے رخ پر بکھر گئی ہے کشاکشِ آرزو کی زردی
نگاہ پلکوں میں الجھی الجھی، زبان سوکھی ہوئی دہن میں

دکھائی دیتی ہے گاہ گاہ ایک روح پژمردہ و فسردہ
اس انجمن سے بہت پرے جو بھٹکتی رہتی ہے اجڑے بن میں

جلال و جمال

وہ نیلے ہونٹوں میں داستانیں وہ کھوئے انداز میں فسانے

وہ گرد سی اُس کے عارضوں پر، شکن سی وہ اُس کے بانکپن میں

وہ اُس کی آنکھوں پہ آنسوؤں کا مہین سا اک سفید پردہ

کہ جیسے اِک نامراد لڑکی پڑی ہو لپٹی ہوئی کفن میں

اگرچہ "ہندوستان" کہہ کر پکارتا ہے اُسے زمانہ

مگر وہ ہے سازِ حریت کا بس ایک بھٹکا ہوا ترانہ

۱۹۳۸ء

زاویۂ نگاہ

کل میرا ننھّا سا بچہ　　عقل کا کچا، بات کا سچا
پھولوں سے جھولی بھر لایا　　مجھ سے کہانی سننے آیا
میں نے کہا "اے بھولے بھالے　　دنیا کے قصّے ہیں نرالے
اے میرے معصوم فرشتے　　جھوٹے ہیں یہ ناطے رشتے
جھوٹی ہے دنیا کی یاری　　سب کے سب پریمی بیوپاری
مایا کے پھندے ہیں سارے　　پاپی سب بندے بے چارے
ہر من پر مایا کا سایا　　مایا چلتی پھرتی چھایا
مجھ سے تجھے کیا آس ہے ننھے؟　　سب کچھ تیرے پاس ہے ننھے

تو مجھ سے کیا سننے آیا؟

باسی کلیاں چننے آیا!"

بچہ پہلے تو گھبرایا　　کومل نینوں کو جھپکایا
پھر بولا "کیا شے ہے مایا؟　　مایا کا کیسا ہے سایا؟
جھوٹ کسے کہتے ہو ابا؟　　کیوں روتے رہتے ہو ابا؟

پریم رس اب بھی ملتا ہے — پریم کنول اب بھی کھلتا ہے
یہ بن میں چڑیوں کی قطاریں — پھولوں پر شبنم کی پھواریں
یہ آکاش پہ کالے بادل — دھرتی جن کے دم سے جل تھل
دریاؤں کی گاتی لہریں — جھلمل کرتی جاتی لہریں
یہ سبزے پر اوس کے قطرے — دھوپ میں جھم جھم کرتے ذرّے
گاگر میں چھلکاتی پانی — پنگھٹ کی البیلی رانی
یہ ننھے تاروں کی لڑیاں — یعنی فرشتوں کی پھلجھڑیاں
چاند کی یہ تھرّاتی کرنیں — کرنیں ٹھنڈے نور کے جھرنے

پریم ہے یہ، مایا تو نہیں ہے
نور ہے یہ، سایا تو نہیں ہے"

بچے کی یہ باتیں سن کر — میں نے کہا: "اے میرے رہبر
تیرے من میں ہے اجیالا — میں پاپوں میں بسنے والا
تیری بصیرت پاک ہے اب تک — روح تری بیباک ہے اب تک
وہ محکومی کی پرچھائیں — آتی ہے کرتی سائیں سائیں

چھپ جا، ورنہ اُس کا سایا
پریم کو کر دیتا ہے مایا"

۱۹۳۹ء

احساسِ غلامی

مٹی میں مل گئی مری فرخندہ اختری
وہ خاک پر پڑا ہے مرا تاجِ سروری

اک موجِ تند و تیز بہا لے گئی مجھے
کام آ سکا نہ وقت پہ فنِ شناوری

اے وائے انقلاب! یہ اعجازِ انقلاب!
دارا کی ٹھوکروں میں ہے تختِ سکندری

احساس مردہ، عشق فسردہ، زبان گنگ
کیا ڈھونڈتی ہے مجھ میں نگاہِ ہنروری

اب مائلِ زوال ہے ہر فنِ دلپذیر
الفاظ کی نمائش، کمالِ سخن وری

کرتی ہے زر کو خاک، جواہر کو خشت و سنگ
مٹی کو زر بناتی تھی جو کیمیا گری

بندوں کے نقشِ پا پہ جبیں سجدہ ریز ہے
بھولا ہوا ہوں میں روشِ بندہ پروری

دریوزہ گرِ جہاں کا، ثنا خواں فرنگ کا
یہ میری شاعری ہے، وہ میری قلندری

۱۹۳۹ء

انتباہ

چارۂ دلِ شکستہ کا آئینہ گر، نہ کر
احساسِ خود نگر کو رہینِ ہنر نہ کر

یہ راہ پُر خطر ہے، سنبھل کر قدم اٹھا
دل میں تڑپ نہیں ہے تو عزمِ سفر نہ کر

ہو جس کے فلسفے میں جوانی کی بے حسی
ایسی قلندری سے مجھے بہرہ ور نہ کر

عصمت کی مشعلوں کو نہ کر وقفِ باغ و راغ
آفاق کے نظام کو زیر و زبر نہ کر

یہ شعبدے ہیں فکرِ تصور پسند کے
بجلی کی چشمکوں پہ گمانِ سحر نہ کر

مشرق کے آفتاب مبادا دبے رہیں
مغرب کے خاوروں کو یہاں جلوہ گر نہ کر

آزادیوں کا زمزمہ خواں ہے مرا کلام
محکوم دوست، جرأتِ نقد و نظر نہ کر

۱۹۳۹ء

استعجاب!

(ہندوستانی شاعر)

دیکھ کر مجھ کو لرز جاتے ہیں سکانِ جہاں
جانے کس جرم سے آلودہ ہے میرا داماں

میں وہ قطرہ ہوں جو دریاؤں کا آئینہ ہے — میں وہ ذرّہ ہوں جو ہے ہمسرِ مہرِ درخشاں
آسماں میری تجلّی کی ہے دھندلی سی نقاب — یا مرے دل میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کا دھواں
مہر و مہ میرے تخیّل کے ہیں اشعارِ لطیف — اور بکھرے ہوئے تارے مرے قدموں کے نشاں
آبشاروں میں مرا ذوقِ طلب نغمہ طراز — میں سمندر کی مچلتی ہوئی موجوں میں رواں
ڈوبتے چاند میں غلطاں ہے مری مدہوشی — میں ابھرتے ہوئے سورج کی کرن میں رقصاں
بوند بن کر کبھی بادل سے ٹپک پڑتا ہوں — برق بن کر میں کبھی ابر میں ہوں شعلہ فشاں
ذرّے میں میری تڑپ، مہر میں پرتو میرا — میں قمر میں متبسم، میں شرر میں لرزاں
طے کیا کرتا ہوں اک پل میں کروڑوں فرسنگ — میری رفتار سے مبہوت ہے چرخِ گرداں
میرے افکار سے شاداب ہے کشتِ احساس — میری پرواز سے لبریز ہے گلزارِ جہاں
میں زمانے پہ کئی رنگ میں عکس افگن ہوں — میں ہوں عالم کے ہر افسانے کا رنگیں عنواں

جلال و جمال

چومتے ہیں مرے قدموں کو سلاطینِ زمن
اور حاجب ہیں مرے قصر کے شاہانِ جہاں
پھر بھی خلوت میں جب اُٹھتے ہیں من و تو کے حجاب
چلنے لگتی ہیں مرے قلب و نظر پہ چھریاں

(غیبی آواز)

مردِ آزاد کے اوصاف ہیں یہ، اے شاعر
اور آلودہ غلامی سے ہے تیرا داماں
تو خیالات میں گم، غیر فتوحات میں گم
تو خرافات میں گم، غیر کرامات میں گم

۱۹۳۹ء

قندیلِ احساس

روکیں مجھے کیا عشق کی الجھی ہوئی راہیں
احساس کی قندیل سے روشن ہیں نگاہیں

جب ابر کے جنگل میں گرجتا ہے اندھیرا
سنگین دھندلکوں میں دھڑکتا ہے سویرا
جب جوش پہ آجاتی ہے ساون کی جوانی
کھیتوں کو چبا لیتا ہے دریاؤں کا پانی
بل کھا کے لپکتی ہیں بگولوں کی قطاریں
چلتی ہیں ہواؤں کی دہکتی ہوئی دھاریں
بے خوف بڑھے جاتا ہوں روکے ہوئے آہیں
احساس کی قندیل سے روشن ہیں نگاہیں

جب روح کی ظلمت میں کوئی نوحہ کناں ہو
عالم کے سمن زار پہ مرگھٹ کا سماں ہو
جب خلوتِ شب میں کوئی تارہ ہی نہ چمکے
پہنائی ادراک میں طوفان ہوں غم کے
جب دل کے دھڑکنے پہ بلکنے کا گماں ہو
جب اپنا وجود اپنی نگاہوں سے نہاں ہو
پاتا ہوں میں گردن میں حمائل تیری باہیں
احساس کی قندیل سے روشن ہیں نگاہیں

جب بھوک سے پھٹ جاتا ہے مفلس کا کلیجا
کہتا ہے "خدا نے مجھے کیوں دہر میں بھیجا

بھولا سا یہ بچہ۔ یہ بہشتوں کا کھلونا
کیوں اس کے مقدر میں ہے دن رات کا رونا

یا بھوک مٹانے کا سجھا کوئی طریقہ
یا چین سے مرنے کا بتا کوئی سلیقہ"

سنتا ہوں جب افلاس کی پُر درد کراہیں
احساس کی قندیل سے جلتی ہیں نگاہیں

۱۹۴۰ء

Sultana

قصرِ فردا

میں آرزوئے چشمۂ حیواں نہ کروں گا
مر جاؤں گا پر حسرتِ درماں نہ کروں گا

اُس دل کو جو یزداں سے رہا محوِ تکلّم
سرمایہ پرستوں میں غزلخواں نہ کروں گا

اب تیری رضا میرے لئے عین خوشی ہے
اب شکوۂ غمہائے فراواں نہ کروں گا

سوکھی ہوئی ٹہنی پہ میں جل جاؤں گا، لیکن
قسمت سے طلب موسمِ باراں نہ کروں گا

بربط مرے نااہل کے آگے نہ بجیں گے
برباد کبھی دولتِ عرفاں نہ کروں گا

یہ خون کا آنسو نہیں مفلس کا دیا ہے
اس شمع کو محلوں میں فروزاں نہ کروں گا

لکھوں گا غریبوں کی بغاوت کے قصیدے
اور بھول کے بھی مدحتِ سلطاں نہ کروں گا

یہ جنسِ گرانمایہ ہے شاعر کا دفینہ
غیرت کو کبھی سر بگریباں نہ کروں گا

اشعار نہیں، راز ہیں یہ ارض و سما کے
دولت کے لئے شعر کو ارزاں نہ کروں گا

۱۹۴۰ء

احساس کی پھریری

یہ خونِ تازہ نہیں، غازۂ جوانی ہے جوانی آتش و آہن کی ہمعنانی ہے
تڑپ تڑپ، کہ تڑپنا ہی زندگانی ہے سکون خواب ہے، اور خواب عیشِ فانی ہے

تری گرفت میں ہے کوکب و قمر کی طناب
اسیر ہیں تری بضعوں میں آسماں کے عقاب

جلالِ برق ہے لرزاں تری نگاہوں میں کئی نجوم فروزاں ہیں تیری آہوں میں
اُس انقلاب کے چرچے ہیں کجکلاہوں میں جو خون بن کے سلگتا ہے تیری باہوں میں

تری جبیں میں کئی آفتاب ہیں ضو ریز
تری خرد میں کئی حکمتیں ہیں گرم ستیز

اجاڑ ہیں تری بستی کے کوچہ و بازار جماعتوں کے ہیں کابوس تیرے سر پہ سوار
تری بہار کا مدت سے لٹ چکا ہے نکھار ترے نکھار پہ قرنوں سے جم چکا ہے غبار

وہ پو پھٹی، وہ ستارے بجھے، وہ صبح ہوئی
ردائے شب کو کترتی ہوئی کرن لپکی

جہان والوں نے رکھا غلام تیرا نام مچا ہوا حرم و دیر میں ہے اک کہرام
اُدھر شعور پہ طاری ہے شوکتِ اصنام اِدھر نشانۂ تاویل ہے خدا کا کلام

وہ نوجوان جو احساس کے صحیفے ہیں
اب الجھے الجھے الف لیلوی لطیفے ہیں

کنواریوں پہ ہے اس زر کے بھوت کا سایہ — ہر ایک قلب کو ہے جس نے بھون کر کھایا
ہر اک زبان پہ ہے جس کے تخت کا پایہ — ریا ہے جس کی بہن اور گناہ ماں جایا

شراب ساغرِ زریں میں جب مچلتی ہے
تو شمع کشتۂ گیتی سے لَو نکلتی ہے

یہ بے محل سے قوانین، اجنبی سا نظام — لبوں پہ مہرِ خموشی، زباں کو اذنِ کلام
یہ قید و بند، یہ تقسیمِ زر، یہ دانہ و دام — یہ جور و جبرِ مسلسل، یہ اختیار کا نام

گرفتِ ساحرِ یورپ میں ایشیا کی عناں!
غروبِ مہر کہاں اور طلوعِ مہر کہاں!

عروجِ آدمِ خاکی کا اعتراف تو کر — مگر تجھے بھی تو پرواز کو ملے ہیں پر
قصور تیرا ہے الزام یہ خدا پہ نہ دھر — کہ مدتوں سے نہ لی اس نے تیرے گھر کی خبر

تری نگاہ میں کیوں اوجِ کوہسار نہیں
نشیب پر تری ہستی کا انحصار نہیں

ترے شعور کو شعلہ زنی کی حاجت ہے — تری خرد کو خرد دشمنی کی حاجت ہے
تری نگاہ کو برق افگنی کی حاجت ہے — ترے یقین کو تردامنی کی حاجت ہے

الجھ نہ دیوِ سیاست کی ہیرا پھیری میں
ترا علاج ہے احساس کی پھریری میں

۱۹۴۰ء

اس دور میں —

ہر شعر مرا اصل میں تاریخِ امم ہے
مجھ کو مری آفاق نوردی کی قسم ہے

اس مردِ قلندر کو سڑی کہتی ہے دنیا
اس دور میں جو طالبِ انصاف و کرم ہے

ہر روح کی خلوت میں جو آباد ہے اب تک
وہ خالقِ اکبر بھی تصور کا صنم ہے

سلجھاتا ہے افلاس کے عقدے وہ سخنور
جو ہاتھ میں تھامے ہوئے سونے کا قلم ہے

ہر شخص ہے سنگین حقائق سے گریزاں
ہر فرد کو محبوب یہی شیوۂ رم ہے

جذبات میں جدت نہ خیالات میں وسعت
تحریر میں رعنائی نہ تقریر میں دم ہے

یخ بستہ ہے نوخیز جوانی کا ارادہ
اور ڈھلتے بڑھاپے پہ گرانبارئ غم ہے

مشرق کی نگاہوں میں ہے ہم پلۂ قرآں
وہ بات جو مغرب کی کتابوں میں رقم ہے

جینے کے لئے اذن ہے قانون کا مطلوب
اللہ ستم ہے، مرے اللہ ستم ہے!

۱۹۴۱ء

نظامِ نو

سرحدِ احساس پہ دھندلا سا یہ تارا ہے کیا!
محفلِ امید میں رقصاں یہ مہ پارا ہے کیا!

کس کے جلووں کی تجلی سے فضائیں دُھل گئیں
چھٹ گئے بادل، دھندلکوں کی ردائیں کھل گئیں

گونج اٹھا کس کے نغموں سے شبستانِ خیال
کس کے دامن کی ہوا سے اڑ گئی گردِ ملال

شوق کی اجڑی ہوئی بستی میں یہ کون آ گیا!
وسعتِ آفاق پر یہ کس کا پرتو چھا گیا

کس نے بھر دی زندگی خاکسترِ بے رنگ میں
پھول یہ کس نے کھلائے سرزمینِ سنگ میں

کس نے ہنگامہ مچایا محفلِ خاموش میں
جانے کیا سرگوشیاں ہوتی ہیں چشم و گوش میں

پردۂ ماضی سے یہ کس نے نکالا اپنا ہات
کس کے پنجے میں سمٹ کر آ رہی ہے کائنات

وہ نقاب اٹھی، وہ اک مشعل سی تھرانے لگی
یہ تو پہچانی ہوئی صورت نظر آنے لگی

۱۹۴۱ء

بیوہ

ترا حسن ہے کس قدر بھولا بھالا
تکلّم انوکھا، تبسّم نرالا

ہواؤں کی گستاخیوں سے دوپٹہ
ذرا سر سے ڈھلکا تو ماتھے پہ ڈالا

نہ گالوں پہ غازہ نہ آنکھوں میں کاجل
نہ ماتھے پہ بندی، نہ گردن میں مالا

نہ کانوں میں جھمکے، نہ کنٹھا گلے میں
حیاؤں سے لبریز چہرے کا پیالا

ہر اک راہرو کی نگاہوں سے بچ کر
پرے ہٹ کے رستے سے گھونگٹ نکالا

تو اُس دورِ تہذیب کی ہے نشانی
تجھے ہند کے اُس تمدن نے پالا

جو بیوہ کے اشکوں سے پھولا پھلا ہے
ابھی جس کی آنکھوں پہ پردہ پڑا ہے

۱۹۴۱ء

میرے افسانے

(مصنف کی دیہاتی کہانیوں کا پس منظر)

تیری نظروں میں تو دیہات ہیں فردوس، مگر
میں نے فردوس میں اجڑے ہوئے گھر دیکھے ہیں

جن کو تو رستم و سہراب کہا کرتا ہے
وہ جواں میں نے یہاں خاک بسر دیکھے ہیں

تیرے ماحول میں ہے جن کی پرستش بھی روا
میں نے اُس حسن کے پُر ہول کھنڈر دیکھے ہیں

میں نے گھوروں پہ پڑے دیکھے ہیں رخشندہ نجوم
میں نے لتھڑے ہوئے کیچڑ میں قمر دیکھے ہیں

میں نے پھولوں کو عفونت میں گھرے دیکھا ہے
میں نے جلتے ہوئے مٹی میں گہر دیکھے ہیں

میں نے ان آنکھوں سے بکتا ہوا دیکھا ہے شباب
زر کی تلوار سے کٹتے ہوئے سر دیکھے ہیں

میں نے دیکھے ہیں رئیسوں کے لتاڑے ہوئے دل
میں نے جھلسے ہوئے آہوں سے جگر دیکھے ہیں

میں نے گلیوں میں تو دیکھے ہیں گلابی چہرے
اور طاعون پس پردۂ در دیکھے ہیں

میں مہاجن کی تجوری کے سمجھتا ہوں راز
میں نے دہقان کی محنت کے ثمر دیکھے ہیں

سبز کھیتوں میں مجھے زہر نظر آیا ہے
زرد خوشوں کی رداؤں میں شرر دیکھے ہیں

میں نے جو دیکھا ہے، اے کاش وہ تو بھی دیکھے
دل کی دھڑکن بھی سنے، دل کا لہو بھی دیکھے

۱۹۴۱ء

نوکری پر جاتے ہوئے

اندھیری راہوں پہ بھاری چھکڑے کے پہیے یوں چرچرا رہے ہیں
کہ جیسے دہقان گو نجتی گھاٹیوں میں کچھ گاتے جا رہے ہیں
اداس تارے خموش جوہڑ میں ڈوب کر غوطے کھا رہے ہیں
شریر جھینگر کہ خشت ہیں ہیں کے تیز نشتر چلا رہے ہیں

میرا وہ ننھا سا پیارا گاؤں نگاہ سے چھپتا جا رہا ہے
مرے گھروندے میں جانے اب تک چراغ کیوں ٹمٹما رہا ہے

منڈیر کی آڑ لے کے شاید ضعیف ماں میری روتی ہو گی
مرے تصور میں آنسوؤں کی اٹوٹ لڑیاں پروتی ہو گی
پچھاڑیں کھا کھا کے میری آپا غریب بے ہوش ہوتی ہو گی
مری صبوحی فراخ آنگن کے عین مرکز میں سوتی ہو گی

مرے گھروندے کا ذرہ ذرہ مجھے نہ پا کر اداس ہو گا
مگر سنا ہے کہ اب کے لاہور کا سفر مجھ کو راس ہو گا

تلاش ہے نوکری کی لیکن دماغ میں آگ جل رہی ہے

جگر میں دوزخ بھڑک رہا ہے، رگوں میں بجلی مچل رہی ہے

گلا نجابت کا کٹ رہا ہے، خودی کی تلوار گل رہی ہے

ندیم کی آہنی جوانی عجیب سانچے میں ڈھل رہی ہے

کبڈی کے دلفریب میلوں میں جس نے کڑیل جواں گرائے

وہ ایک چھکڑے میں رینگتا جا رہا ہے بیچارہ سر جھکائے

میں جانتا ہوں کہ روندی جائے گی نوکری میں مری جوانی

فسانہ گوئی نہ ہو سکے گی، پنپ سکے گی نہ شعر خوانی

تباہ کر دے گی میری صبحیں اداس شاموں کی خوں چکانی

رہیں گے دو چار شعر میری حیاتِ بے مایہ کی نشانی

مگر مجھے بھی کبھی کبھی بھوک تنگ کرتی ہے، کیوں، نہ جانے

یہ طائرِ سدرہ بھی چنے گا زمین کی وسعتوں میں دانے

مجھے نہ بھولیں گی اپنے گاؤں کی میلی میلی سی تنگ گلیاں

وہ شام پڑتے ہی تنگ گلیوں میں نوجوانوں کی رنگ رلیاں

وہ آنکھوں میں بولتے ستارے وہ گالوں میں کھلکھلاتی کلیاں

وہ پاؤں میں جھنجھناتے گھنگھرو، گلے میں وہ ٹنٹناتی ٹلیاں

وہ ناچ۔ اور ناچ کے بہانے سے اپنے محبوب کو اشارے

دبی دبی مسکراہٹوں میں وہ لوٹ جانا خوشی کے مارے

مجھے نہ بھولے گا وہ کبڈی کے کھیل میں تن کے باھر آنا
وہ اپنے ہمراز دوستوں کو نئی نئی کسرتیں دکھانا
وہ ایک انداز سے مقابل کے نوجوانوں پہ مسکرانا
وہ برق بن کر تڑپتے جانا، بگولا بن کر لپکتے آنا
وہ شانوں کے گول گول پٹھے، وہ ابھرے اور لال لال سینے
نہ روح میلی، نہ کھوٹ من میں، نہ بات بے رس، نہ دل میں کینے
مجھے نہ بھولے گی پیاری امّی، مجھے نہ بھولے گی بھولی آپا
مجھے نہ بھولے گا وہ گھروندا جہاں کا میں حکمراں رہا تھا
وہ کچی دیواریں، بوڑھی بیری، وہ آنگن اور کبک کا وہ پنجرا
وہ میرے ہنستے ہوئے پڑوسی وہ ایک دہقان دوست میرا
مری صبوحی، وہ میری پیاسی نگاہ کا اوّلیں سہارا
مرے خیالات کے اندھیرے افق پہ وہ زرفشاں ستارا
میں جب کبھی اپنا کام کر کے سکون کی ایک آہ لوں گا
تو اپنی تخییل کے خزانے سے تیز سی اک نگاہ لوں گا
پلک جھپکنے میں اڑ کے میں اس غریب گھر میں پناہ لوں گا
اگرچہ یہ راہ پُر خطر ہے، یقین ہے، میں نباہ لوں گا

اُٹھوں گا دفتر سے جب کھُلی میز پر کئی فائلیں جما کر
تو اپنے گاؤں پہ آ کے منڈلاؤں گا تصوّر کے پر لگا کر

دیا بجھا دے، دیا بجھا دے، نہ رو، نہ رو، میری پیاری امّی
ستارے اشکوں کے اتنی افراط سے نہ کھو میری پیاری امّی
میں لوٹ آؤں گا کچھ کما کر حزیں نہ ہو میری پیاری امّی
بس اب تو چھت سے اتر، کھٹولے پہ جا کے سو میری پیاری امّی

ترا ندیم ایک روز لوٹے گا نوکری کا خزینہ لے کر
خزینہ لیکن یہ پائے گا اپنی شاعری کا دفینہ دے کر

۱۹۴۱ء

ایک چیخ

میں نے کل رات ایک چیخ سُنی
پے بہ پے کروٹیں بدلتی ہوئی
اک گلی سے بگولا بن کے اُڑی
شہر کی وسعتوں پہ پھیل گئی
خامشی کا طلسم ٹوٹ گیا
اور فضاؤں کو رعشہ چھوٹ گیا
میں جونہی پھینک کر قلم، لپکا
چٹکنی کھولنے ہی والا تھا
کہ مری انگلیاں اکڑ سی گئیں
اور کہیں میری آنکھیں گڑ سی گئیں
دفعتہً اُس گلی کے نکڑ سے
میں نے دو چار قہقہے سے سنے
قہقہوں کی ردا میں لپٹی ہوئی
چند سکّوں کی کھنکھناہٹ تھی

۱۹۴۱ء

نیا ساز نئی تان

شدتِ درد میں بیکار ہے مرنا تیرا

زندگی سے تجھے نفرت ہی سہی

موت پیغامِ مسرت ہی سہی

ڈوب مرنے سے تو بہتر ہے ابھرنا تیرا

قافلے رات کی ظلمت میں بھٹک جاتے ہیں

لیکن ایسی بھی اک آتی ہے گھڑی

صبح کا مست گجر بجتے ہی

پردہ ہائے شبِ تاریک سرک جاتے ہیں

جم چکا ہے ترے احساس پہ صدیوں کا غبار

چہرہ روشن ہے، مگر رنگ نہیں

دھڑکنیں دل کی ہم آہنگ نہیں

ہے جوانی تری ناکام امنگوں کا مزار

تیرے ماحول پہ طاری ہے تعیش کا جمود

حُسن کو حسن فروشی کا جنوں

عشق پر جلوۂ عریاں کا فسوں

شعلہ ناپید ہے، باقی ہے فقط پردۂ دود

شب تاریک میں تُو پھرتا ہے آوارہ سا

جب بہت دور درختوں کے تلے

کوئی بھٹکا ہوا جگنو چمکے

قلب میں تیرے دہک اُٹھتا ہے انگارہ سا

جب کبھی رقص کے گونجے ہوئے ایوانوں میں

سرسراتے ہیں حریری ملبوس

جگمگاتے ہیں سنہری فانوس

بھوت سرگوشیاں کرتے ہیں ترے کانوں میں

موٹریں جب ترے پہلو سے نکل جاتی ہیں

چھوڑ کر تند بگولوں کی قطار

پھینک کر رُخ پہ ترے گرد و غبار

بجلیاں سی ترے سینے میں مچل جاتی ہیں

جب کسی محل سے سمٹی ہوئی باہر آئے
کوئی افلاس زدہ دوشیزہ
اپنی عصمت کا چکا کر سودا
پھیل جاتے ہیں ترے ذہن پہ غمگیں سائے

مسجدیں چند دکھاوے کی نمازوں کے مقام
دیر میں مورتیاں ہیں حیران
منسی والے کے پجاری ہیں کہاں
قحبہ خانوں میں کھنکتے ہیں مگر جام سے جام

ایسے جینے سے تجھے موت کا جنگل ہے پسند
زندگی اب تری گمراہ سی ہے
تیری ہر سانس میں اک آہ سی ہے
ٹوٹ جانے کو ہے اب تیری امیدوں کی کمند

لیکن اب روح زمانے کی ہے طوفاں بکنار
کٹ کے گر جائیں گے بکھر و بر پر
اندھے بوسیدہ عقیدوں کے سر
کون کہتا ہے کہ بھرپور نہیں وقت کا وار

اپنی مایوس جوانی کی کہانی نہ سنا

یہ حزیں عہد ہے جانے والا

اِک حسیں دور ہے آنے والا

اب نئے ساز کی آمد ہے نئی تان اُڑا

—

۱۹۴۱ء

کچھ تو کر

کملائی ہوئی روح کو یارب گلِ تر کر
اس جامِ سفالیں کو کبھی ساغرِ زر کر

جب تیرے اشارے سے چٹک جاتے ہیں غنچے
امید کی منہ بند کلی پر بھی نظر کر

دل کو — جسے خاکسترِ دل کہتی ہے دنیا
انوار کی لو ڈال کے — تابندہ شرر کر

اب میرے لئے تنگ ہے یہ عالمِ بے رنگ
بوسیدہ ہے یہ قصر، اسے زیر و زبر کر

کب تک ترے بندوں کی غلامی پہ کروں ناز
تاروں کے نشیمن سے بھی اونچا مرا سر کر

گر نخلِ تمنا کو ثمرور نہیں کرتا
افسانۂ اکرام بعنوانِ دگر کر

اس پر بھی اگر تیرا کرم کچھ نہیں کرتا
گستاخ کلامی سے مری قطع نظر کر

یہ بھی نہیں منظور تو اے مبدءِ الطاف
احساس مرا چھین، مجھے خاک بسر کر

———

١٩٢١ء

کھیل

دھرتی کا جو سینہ چیرے آخر منہ کی کھائے
زر کی خاطر خون بہائے لیکن خاک نہ پائے

جگ کی جھولی بھرنے والا اور دامن پھیلائے
ہرے بھرے کھیتوں کا آقا اور فاقوں مر جائے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ دیکھا جائے

یہ کہساروں کی دیوی، یہ بے پروا چرواہی
جس کی ایک اداس نظر سے رستہ بھولیں راہی

دل کو ہلکورے سے دے جس کی مخمور نگاہی
اور اک دور کا دولت والا اُس کا مول چکائے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ دیکھا جائے

گاؤں کے البیلے بانکے مستانے متوالے
بھولی بھالی دہقانی ماؤں کی گود کے پالے

جن کے ساتھی چیت کے جھونکے اور ساون کے جھالے
اُن کو ایک غلیظ مہاجن ہتھکڑیاں پہنائے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ دیکھا جائے

مٹی کے معصوم گھروندے حسن کی یہ درگاہیں
کھیتوں میں بل پہ بل کھاتی پتلی پتلی راہیں

گھنے گھنے یہ جنگل، جن میں بھٹکیں تیز نگاہیں
اور یہاں منعم، مرمر کی محلسرا بنوائے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ دیکھا جائے

قدم قدم پہ یہ گاگر کو چھلکاتی پنہاری
آنکھوں میں تاروں کی لو، سانسوں میں مے کی دھاری
اٹھی ہوئی باہوں کے خم میں اڑنے کی تیاری
اور اک ریشم پوش شکاری اُس پر تاک لگائے
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ دیکھا جائے

زریں ٹیلے، مست کھجوریں، خاموشی، رعنائی
پھٹے پُرانے خیمے، یعنی یہ قریے صحرائی
جب ان پر چھا جاتے ہیں تہذیبوں کے سودائی
دھرتی ماتا چلاتی ہے "میں لٹتی ہوں، ہائے!"
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ دیکھا جائے

آزادی پر مرنا لیکن زنجیروں سے ڈرنا
بڑی بڑی تنخواہیں پانا اور من مانی کرنا
خود ہی آگ لگانا اور الزام کسی پر دھرنا
شاعر اور بھانڈوں کی طرح نوابوں کے گن گائے
مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ دیکھا جائے

۱۹۴۲ء

نیا منصور

ہے فرض مرا کچھ کام کروں
روشن دنیا میں نام کروں
جذباتِ محبت عام کروں
عفریتِ خرد کو رام کروں
جب ہمتِ یک دو گام کروں
جگ میں برپا کہرام کروں
خود صبح کروں، خود شام کروں
جب تھک جاؤں آرام کروں

اِس دورِ غلامی میں لیکن
کچھ کام نہیں، کیا کام کروں

محکومی عذرِ لنگ نہیں
ہیں چنگ مگر آہنگ نہیں
ہیں رنگ مگر ارژنگ نہیں
ہے بادہ مگر گلرنگ نہیں

گو ذوق کے میداں تنگ نہیں
سینوں میں شوقِ جنگ نہیں
احساسِ حریر و سنگ نہیں
پروائے نام و ننگ نہیں

رُکتا ہے دم، دکھتے ہیں قدم
گو منزل دو فرسنگ نہیں

کہتے ہیں دنیا فانی ہے
نادانی سی نادانی ہے
تخلیق کا راز جوانی ہے
جب پیشانی نورانی ہے
جب ساماں بے سامانی ہے
جب فطرت ہی طوفانی ہے
کیا خشکی ہے کیا پانی ہے
سلطانی ہی سلطانی ہے

اِس دورِ غلامی میں لیکن
انجامِ سفر حیرانی ہے!

جلال و جمال

سب کہتے ہیں معذور ہوں میں

مجبور رہوں میں؟ مجبور رہوں میں

نومیدی سے مسحور ہوں میں،

وجدان سے کوسوں دور ہوں میں

بہتاں! کہ شبِ دیجور ہوں میں

پُر نور ہوں میں، پُر نور ہوں میں

دشنام! کہ غم سے چور ہوں میں

مزدور ہوں میں، مزدور ہوں میں

ڈر، میری "انا" کی آگ سے ڈر

منصور ہوں میں منصور ہوں میں

۱۹۴۲ء

دُنیائے خام

سکونِ دل جراحت خوردۂ اوہام ہے اب تک — الٰہی! نسلِ آدم کشتۂ آلام ہے اب تک

شبوں کو زندگی اک حبس سا معلوم ہوتی ہے — اگرچہ بزمِ انجم زحمتِ یک گام ہے اب تک

زمانہ جانتا ہے امن ہے جوہر تمدن کا — مگر شمشیرِ استبداد خوں آشام ہے اب تک

اگرچہ حریت کے نور سے روشن ہیں دل سب کے — زمیں پر شیوۂ انساں فروشی عام ہے اب تک

کئے وا میں نے عقدے کس قدر اسرارِ عالم کے — حقائق پر مگر چھایا ہوا ابہام ہے اب تک

زمانہ ساغرِ زر ہر گھڑی جب کھنکھناتا ہے — مرے ہاتھوں میں کیوں ٹوٹا ہوا اک جام ہے اب تک

اگر لوح و قلم کے بس میں ہے تقدیر انساں کی — تو مجبوری مری کیوں موردِ الزام ہے اب تک

جسے خارا شگافی کے طریقے تو نے سکھلائے — وہی مردِ قلندر لرزہ بر اندام ہے اب تک

اُٹھے تھے جس کی خاطر کہکشاں کے نقرئی پردے — وہی بے باک شاعر مرغِ زیرِ دام ہے اب تک

نظامِ دو جہاں کو ایک کروٹ کی ضرورت ہے
بایں دعوائے محکم تیری دنیا خام ہے اب تک

۱۹۴۲ء

رازِ گریز

دیارِ ہوش کی بے کیفیوں سے کوسوں دور
اک ایسا دیس ہے خوابوں کے نشہ زاروں میں

جہاں حیات، سکون و سرور و مستی ہے
غمِ زوال پرافشاں نہیں ستاروں میں

ہے بے نیازِ خزاں جس کی وادیٔ گلپوش
ہجومِ نکہت و مستی ہے سبزہ زاروں میں

اُفق پہ کانپتے ہیں گہرے اور سنہرے غبار
ترانے لوٹتے ہیں دم بخود نظاروں میں

بجائے برق، چھنکتے ہیں مرمریں خلخال
گرج کی جگہ ترنّم ہیں ابر پاروں میں

فلک کی لمبی مسافت سے تھک کے شمس و قمر
دھندلکے اوڑھ کے سوتے ہیں کوہساروں میں

وہی جہاں ہے مرے مرکزِ نظر کا مقام
وہیں ملی ہے مجھے لذتِ حیاتِ دوام

مری اڑان کو دنیا گریز کہتی ہے
مرے خیال کی پرواز کو شکستِ حیات

مگر خموش شبوں میں یہ راز مجھ پہ کھلا
کہ بے خروش ہے محکوم کی حیات و ممات

یہاں غنیم کا کھٹکا نہ حادثاتِ ستیز
نہ ذوق و شوقِ شہادت، نہ حریت کے نکات

امیر ساقی و ساغر کے مخمصوں میں اسیر
غریب زر کو سمجھتے ہیں قاضی الحاجات

جہان تیرہ نہ میرے جنوں کو راس آیا کہ اس میں رات بھی ہے رات اور دن بھی رات
میں کیوں نہ شعر کی اُن رفعتوں پہ اُڑتا پھروں جہاں سمجھتا ہوں محکومیوں کو خواب کی بات

جو اَب بھی چاہو، تو آؤ جہاں کو تڑپائیں
وگرنہ جوڑ کے پَر آسماں پہ اُڑ جائیں

۱۹۴۲ء

ماضی و مستقبل

بیتی گھڑیوں کی مے سے یادوں کے کدو لبریز سہی　　مستقبل کا خون ہوں گا بادۂ ماضی تیز سہی

گذرے لمحوں کی لاشوں پر گدھ بن کر منڈلانا کیا　　جس کو صدیاں روند چکی ہوں اس ہیرے کا پانا کیا

بزم میں بلوریں ساغر کے ٹکڑوں کا کیوں ڈھیر رہے　　دن کے اجیالے میں میری دنیا کیوں اندھیر رہے

ماضی کے سوکھے پنجر میں اندھی روحیں روتی ہیں　　وقت کے فولادی پنجے میں مستقبل کے موتی ہیں

ماضی کا ویرانہ اجڑا اُجڑا سونا سونا ہے

مجھ کو تو مستقبل کے مدہوش افق کو چھونا ہے

اِنسانوں کو انسانی عظمت کا اب احساس نہیں　　اِس یزدانی شعلے کو صدیوں کی غلامی راس نہیں

اس کی تدبیروں پر حاوی تحریریں تقدیروں کی　　اس کی تقریروں پہ مسلط زنجیریں تعزیروں کی

خون اسی کا کھپتا ہے ایوانوں کی گلکاری میں　　قلب اسی کا تپتا ہے طیاروں کی تیاری میں

ماضی کے قصوں سے میرا جی بہلاوا کیا ہو گا　　ماضی کی بیڑی پہنے فردا پر دھاوا کیا ہو گا

میں مستقبل کا شاعر ہوں جو بھی کہوں کہہ لینے دے

ظلم جو نسلوں پر ٹوٹیں گے وہ مجھ کو سہہ لینے دے

۱۹۴۳ء

سلجھی الجھنیں

آذرِ جہاں کا طالب کیوں ہے ولولۂ اعجاز نمائی
ریشم کے زنداں میں کیوں سمٹے جذبۂ وحشت کی گیرائی

یہ پُرشور عبادت خانے مقتل ہیں احساسِ جواں کے
بندوں کا محتاج نہ ہوگا حُسنِ مشیت کا شیدائی

چاہوں تو تخلیقِ جہاں کے سب اسرار نمایاں کر دوں
لیکن مجھ کو روک رہی ہے جذبۂ یزداں کی رسوائی

اک زنجیر کی اتنی کڑیاں! اک مالا کی اتنی لڑیاں!
وہ بحری، یہ کوہستانی، وہ میدانی، یہ صحرائی!

غازہ و خوشبو کے جالوں سے وہ انساں کیوں دھوکا کھائے
جس کے تصور پہ طاری ہو حسنِ ازل کی سادہ ادائی

روح کے ویرانوں میں کب تک ظلمت کے اژدر پھنکاریں
تاروں کے چمکانے والے تیری دہائی! تیری دہائی!

میری افسردہ امیدوں کو وہ ان جانا زور عطا کر
جس کے دم سے قائم و دائم چرخ کا ایوانِ مینائی

سانس کی ڈوری پر کرتا ہے ناچ اجل کا اندھا جتنا
دل کی دھڑکن رک جانے سے میں نے یہ الجھن سلجھائی

مجبوروں کے تند ارادے جباروں پہ فاش نہ کر دیں
راز جنہیں محکومیِ پیہم نے بخشا ملبوسِ خدائی

۱۹۴۳ء

نئی صبح

سازِ احساس کے ہر تار کو چھیڑا میں نے
دلنشیں گیت چرائے برسوں
نغمہ سمجھا تھا تنفس کا بکھیڑا میں نے
دائرے لَے کے بنائے برسوں

جو تمنا مرے سینے سے اُٹھی، گیت بنی
روح بربط تھی، ارادہ مضراب
شاید اس ڈھنگ سے ہر ہار مری جیت بنی
غم و اندوہ رہے پا بہ رکاب

تیرگی پر بھی تجلی کا گماں رہتا تھا
میں نے ہر زخم کو تارا سمجھا
عین پت جھڑ میں بہاروں کا سماں رہتا تھا
میں نے ٹھوکر کو سہارا سمجھا

زندگی چند فریبوں میں گنوا دی، لیکن
بدلیاں چاند پہ چھاتی ہی رہیں
خوب اور زشت کی گو قید اٹھا دی، لیکن
آندھیاں طیش میں آتی ہی رہیں

وقت کے آہنی پنجے میں پھڑکتا ہی رہا
حریت خواہ ارادہ میرا
مدتوں سینۂ گیتی میں دھڑکتا ہی رہا
ہر تا پھرتا ہوا جادہ میرا

ظلم کے سائے بڑھے ۔ اور بڑھے ۔ اور بڑھے
میری امید گھٹی ۔۔۔ اور گھٹی
غم کے سیلاب چڑھے ۔ اور چڑھے ۔ اور چڑھے
زندگی میری لٹی ۔۔۔ اور لٹی

آخر اس راہ پہ اک خطۂ ویراں آیا
چار جانب تھیں پرانی قبریں
چھا گیا ذہن پہ گنبد کا انوکھا سایا
قحط کی جیسے بھیانک خبریں

خشک ڈھانچوں میں زمانے کے دیئے جلتے تھے
جس طرح رات کو مرگھٹ میں چتا
کیڑے گلتے ہوئے اجسام میں یوں چلتے تھے
جیسے کھپریل کے چھپر میں ہوا

کتنے محبوب تھے افلاس کے نخچیروں میں
دل میں ناسور، لبوں پر آہیں
کتنے دلگیر تھے جکڑے ہوئے زنجیروں میں
ہاتھ روندے ہوئے، کچلی باہیں

ایک یہ طرفہ تماشا بھی نظر سے گذرا
محل قائم تھا، مکیں غائب تھا
میں جب اس محل سے کترا کے اُدھر سے گذرا
دنیا بیدار تھی، دیں غائب تھا

میں نے ماحول سے گھبرا کے جب اک آہ بھری
قلبِ گیتی میں دھماکا سا ہوا
ناچتی آئی کسی سمت سے اک لال پری
چوڑیاں گائیں، چھناکا سا ہوا

آتشیں رقص کی رفتار کمانیں ابھریں — لپکے سنسان خلاؤں میں تیر
ساز، سانس کی سوتی ہوئی تانیں ابھریں — آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھے نخچیر

گیت ہی گیت تھے مبہوت فضاؤں میں رواں — دم بخود عزم نے لی انگڑائی
سمٹا نومیدیٔ جاوید کا پُرہول دھواں — اینڈتی صبح کی دیوی آئی

۱۹۴۴ء

سُہاگن بیوہ

(نا رضامندی کی شادی پر)

نہ بزرگ باپ سے کچھ گلہ، نہ غریب ماں سے ملال ہے
نہ کسی کے رحم کی آرزو، نہ درازدستِ سوال ہے

مری زندگی کے نصیب میں جو خزاں ہی تھی تو خزاں سہی
مجھے آہ و نالہ سے کام ہے جو یہاں نہیں تو وہاں سہ

جو فلک پہ بیٹھے ہوئے خدا کی یہی رضا ہے تو شکر ہے
جو عدالتِ مہ و سال کا یہی فیصلہ ہے تو شکر ہے

مگر اک عجیب کریدسی مرے دل میں رہتی ہے پرفشاں
کہ مرا مقدرِ غم نشاں مجھے لے چلے گا کہاں کہاں

مرے لالہ زارِ شباب میں ابھی اور آندھیاں آئینگی
مرے آسمانِ خیال پر ابھی اور بدلیاں چھائیں گ

مرے مرغزارِ حیات پر کئی بجلیوں کی نگاہ ہے
مرا احتجاج بھی کفر ہے مرا بولنا بھی گناہ ہ

مجھے اپنے حال پہ چھوڑ دو مری غم نصیب سہیلیو
مری جیتی جاگتی موت پر نہ کرو غریب

جو تمام باغ اجڑ گیا تو کلی کا رنج فضول ہے
جو تمہیں بھی کرنا ہے ایک دن وہ سفر مجھے بھی قبول ہے

۱۹۴۳ء

حرّیتِ فکر

کتنے بے تاب چراغوں کے دھوئیں سے میں نے — اپنے افکار کا موہوم ہیولیٰ ڈھالا
کتنے بجھتے ہوئے چہروں کے عرق سے میں نے — برسوں فردا کا چمکتا ہوا پودا پالا
کتنی محجوب نگاہوں کی شعاعیں لے کر — اپنے ظلمت زدہ احساس کو دیکھا بھالا
کتنے مرتاض فقیہوں کے عقیدے سے ٹکر — اپنے ایمان پہ ادراک کا پرتو ڈالا
کھول کر کتنے ہی انفاس کے ژولیدہ تار — دل کے بکھرے ہوئے منکوں کی پرو دی مالا
عزم اس طرح خیالوں میں ضیا بار رہا — جیسے تاریکیٔ صحرا میں چراغِ لالہ

اس مشقت سے مگر آج بھی بے پروا ہے
دامنِ صبح سے تاروں کو بجھانے والا

راہِ الفت میں حمیّت کو لٹانے پر بھی — میری کمزور امنگوں کو سہارا نہ ملا
کتنے بہکے ہوئے محلوں میں ہوا میرا گذر — کسی محفل میں مجھے انجمن آرا نہ ملا
ڈھونڈھ لیں کرۂ خاکی کی طنابیں میں نے — آسمانوں سے مگر کوئی اشارا نہ ملا
جس کی لہروں سے جبینوں کی سیاہی دھلتی — مجھکو اس آتشِ سیّال کا دھارا نہ ملا
کتنی پر ہول خلیجوں سے گذر کر بھی مجھے — اپنی ہستی کے سمندر کا کنارا نہ ملا
اپنے اسلاف کی تاریخ کو چھانا پھٹکا — گرم تھی راکھ مگر کوئی شرارہ نہ ملا

اُفقِ دل پہ وہ گھنگھور گھٹا گھرتی رہی
کہ مجھے رات کو بھی کوئی ستارہ نہ ملا

اب یہ محسوس ہوا ہے کہ مری مجبوری
مرے سمٹے ہوئے ماحول کا افسانہ ہے

اِن صداؤں سے تو دریوزہ گری بہتر تھی
مری فریاد کی بنیاد کلیمانہ ہے

کیسے مانوں کہ یہ فانوس ہے یا منبعِ نور
جب مرے سامنے خاکسترِ پروانہ ہے

اُف یہ سہمی ہوئی راتیں، یہ ترستے ہوئے دن
میری دنیا کا سر انداز گدایانہ ہے

سجدہ گاہوں کی سلاسل ہیں خیالوں کے فریب
اب نگاہوں میں نہ کعبہ ہے نہ بتخانہ ہے

اک نئے شوق سے لبریز ہے پیمانۂ دل
اب نہ وہ بام نہ وہ جلوۂ جانانہ ہے

المدد اے مرے پرواز کے رنگیں خوابو
مجھ کو صدیوں کے دھندلکوں سے بچائے جانا ہے

رقص کے ساتھ اگر ساز کی جھنکار نہ ہو
تو اک الجھی ہوئی زنجیر ہے یہ فنِ سلیم

حُسن کے پاس اگر عشوۂ صد رنگ نہ ہو
اس سے بہتر ہے کہیں دشت کے پھولوں کی شمیم

زیست کی راہ میں خطرے نہ اگر منڈلائیں
تو یہ انفاس کے تاروں کی ہے بوسیدہ گلیم

"اختیارات کی تقسیم ہے مجبور کی موت"
مٹ چکا کب سے فلاطوں کا یہ اعلانِ قدیم

ایک مرکز پہ گھماؤں گا نظامِ کونین
کہ کسی کا بھی نہیں دعویٰ شاہی تسلیم

روشن اذہان کی تعمیر ہے مقصود اپنا
نہ مجھے خطرۂ تاخیر، نہ شوقِ تقدیم

یہ کہیں حریتِ فکر کی آواز نہ ہو
قصرِ فردا سے مجھے کون بلاتا ہے ندیم

۱۹۴۳ء

ارادے

اگر بس چل سکا میرا تو اپنے ہمصفیروں کو
اڑا کر خاک سے، ہم پلۂ خاور بناؤں گا

اٹھا دوں گا تمدن کے نقاب اپنی امنگوں سے
میں اپنی زندگی کو اک کھلا منظر بناؤں گا

ارادوں کی براہیمی میں جوشِ تازہ بھرنے کو
میں اپنے ذہن میں بت خانۂ آذر بناؤں گا

قسم ان آسمانی مشعلوں کے رقصِ پیہم کی
ستاروں کے لہو سے بادۂ احمر بناؤں گا

مجھے افلاک کی فرسودہ رفتاری سے شکوہ ہے
کواکب کے کھنڈر پر اک نیا کشور بناؤں گا

پرانی ہو چکی تاریخ انسانی عزائم کی
نئے لشکر نکالوں گا، نئے خیبر بناؤں گا

کہاں جائیں گے یہ غمازِ انسانی ذہانت کے
میں اپنے فرش کو جب عرش کا ہمسر بناؤں گا

مقرر دائروں پر ڈھیر ہیں قرنوں کی لاشوں کے
نظامِ دہر کی خاطر نیا محور بناؤں گا

غلامی کی چڑیلیں سانس تک لینے نہیں دیتیں
میں یہ سب کچھ بناؤں گا مگر کیونکر بناؤں گا

۱۹۴۳ء

ہُوک

پھر وہی پتلی گلی ہے، وہی دھندلی شمعیں
پھر اُسی موڑ پہ، لپٹی ہوئی چلمن کے قریب
پھر وہی تنگ دریچوں میں خیالی پیکر
چند گذری ہوئی گھڑیوں کے پریشاں منظر

پھر اُنہیں ریشمی پردوں میں ہوئی جنبش سی
پھر اُنہیں نقرئی باہوں کی شعاعیں اُٹھیں
جن کی لرزش تھی ترے دردِ نہاں کی غمّاز
جن کے ہالے میں دھڑکتے تھے مرے عشق کے راز

پھر وہی حسن کی آغوش، تمنا کا خروش
پھر خیالوں کا نگاہوں سے وہ خاموش کلام
پھر وہی دَور جو افلاک کا محکوم نہیں
جس کے اسرار فرشتوں کو بھی معلوم نہیں

حُسن روتا ہے کہ فانی ہے محبت کا گداز
عشق اس فکر میں غلطاں ہے کہ انسان کا دل
زندگی چند فریبوں کا صنم خانہ ہے
اپنے ہی رقص کے ادراک سے بیگانہ ہے

یہ جوانی کے تقاضوں پہ سیاست کی گرفت
یہ مذاہب کی جبینوں پہ غلامی کے غبار
یہ رواجوں کے شکنجوں میں مزاجوں کے چمن
یہ خیالات پہ عفریتِ شہی سایہ فگن

یہ تذبذب کا جہنم! یہ ارادوں کا مزار!
جس میں قوت ہے مگر ہمت پیکار نہیں

سطح پر تیرتا ہے، تہ پہ نہیں جا سکتا
آنکھ وا ہے، مگر احساس ہی بیدار نہیں

خون ارزاں ہے، مگر نانِ جویں ہے نابود
اور شکم صرف تسلی سے نہیں بھر سکتے

اپنی فطرت ہی عفونت پہ رضامند ہوئی
ہم مشیت پہ یہ الزام نہیں دھر سکتے

پھر اسی خطۂ مدہوش میں آ نکلا ہوں
جس میں افکار کی زنجیر بکھر جاتی تھی

اک غنودہ سی تڑپ، اک مترنم سا سکوت
زندگی خواب کی پرچھائیں نظر آتی تھی

لیکن اب پہلوئے محبوب میں وہ کیف کہاں
آبلے پھوٹ تو نکلے ہیں، جلن باقی ہے

سوچتا ہوں، کہ زمانے کے کھنڈر میں اب تک
کس لئے بستر سنجاب و سمن باقی ہے!

۱۹۴۳ء

تاریخ پلٹا کھائے گی

صدیوں کے سائے کے تلے — رقصاں ہیں ماضی کے دیئے
یادوں کے پرانے یہاں — بُنتے ہیں دھندلے دائرے
اُڑتی ہوئی گھڑیوں کے پَر — ہر سمت ہیں پھیلے ہوئے
کتنے شکستہ حوصلے — کتنے دریدہ ولولے

کتنے ہراساں قہقہے
کتنے پشیماں غلغلے

پھٹتے ہوئے پنجر کہیں — پھیلے ہوئے جوہر کہیں
اُجڑے ہوئے بادہ کدے — ساقی کہیں، ساغر کہیں
ایوانِ شاہی کے کھنڈر — گنبد کہیں اور در کہیں
بگڑی ہوئی لاشیں کہیں، — ٹوٹے ہوئے خنجر کہیں

دلدل میں چکراتے ہوئے
تارے کہیں، خاور کہیں

اک غار کے پاتال سے — ناگاہ اک سایہ اٹھا

اُبھرا، رکا، لرزا، بڑھا ٹھٹکا تو سر کے بل گرا
بھاگا تو ٹخنے بج اُٹھے ریزگا تو اپجھے دست و پا
بدلیں کچھ ایسی کروٹیں بادل سا اُمڈا ڈھول کا
آخر وہیں پا مال ہیں
کچھ بڑبڑا کر کھو گیا

اک سمت سے آئی صدا برسوں کی پہچانی ہوئی
روحِ غلامانِ جہاں! یہ تجھ سے نادانی ہوئی
قوت ہے استبداد کی جانی ہوئی، مانی ہوئی
دربارِ یزداں سے اسے وہ آگ ارزانی ہوئی
جس میں چٹان احساس کی
جب گھر گئی، پانی ہوئی

ناگاہ صدیوں کی تہیں، تھرائیں کانپیں، کٹ گئیں
ماضی کی سب پرچھائیاں دھندلے افق تک ہٹ گئیں
بیتے دنوں کی بدلیاں گلے سے بن کر بٹ گئیں
زہرہ کو چھوتی رفعتیں بھولے دھوئیں سے اٹ گئیں
یادوں کی گہری ظلمتیں
کٹ کر فضا میں چھٹ گئیں

لاوے کو شرماتا ہوا نعرہ اٹھا پاتال سے
فولاد دب سکتا نہیں، سونے کی نازک ڈھال سے
تلوار کی جھنکار کو نسبت نہیں خلخال سے
مرتے نہیں شیروں کے دل برسوں کے اضمحلال سے
تاریخ پلٹا کھائے گی!
ماضی بنے گا حال سے"

۱۹۴۳ء

کیسے ہنسوں؟

اپنے اشکوں کو مہ و مہر بنا لوں، تو ہنسوں
آرزوؤں کی خلاؤں کو سجا لوں، تو ہنسوں

ان طبیبوں کو، جنہیں زعمِ مسیحائی ہے
دل کے رستے ہوئے ناسور دکھا لوں، تو ہنسوں

جس کو اسلاف نے فریاد کی صورت بخشی
نئے انداز میں اُس گیت کو گا لوں، تو ہنسوں

ان کی گردش نے بجھائے ہیں ارادوں کے چراغ
اپنے قدموں پہ ستاروں کو گرا لوں، تو ہنسوں

جن کو منعم نے گہر کہہ کے مجھے بخشا تھا
ان خزف ریزوں کا انبار لٹا لوں، تو ہنسوں

مجھ کو احرار کی محفل میں تو لایا ہے نصیب
اپنے ماتھے کی سیاہی کو چھپا لوں، تو ہنسوں

مجھ پہ تقدیر نے پھینکے ہیں یہیں سے دشنے
قصرِ افلاک کے مینار جھکا لوں، تو ہنسوں

جس کے اعجاز سے روشن تھی جبینِ اسلاف
خاکِ ماضی سے وہ اکسیر بنا لوں، تو ہنسوں

مٹ گیا زخم، مگر اس کی کسک باقی ہے
چارہ سازو، ہیں ذرا ہوش میں آ لوں، تو ہنسوں

سالہا سال جسے حاجتِ مرہم ہی رہی
اپنی تاریخ سے وہ داغ مٹا لوں، تو ہنسوں

یوں تو گذرا ہوں کئی بار ترے کوچے سے
بھیک پا لوں تو ہنسوں، آنکھ ملا لوں تو ہنسوں

۱۹۴۳ء

جبر

ایسی راز بھری خاموشی حدِ نظر تک چھائی ہوئی ہے — جیسے آوارہ فطرت کو بھی گہری نیند آئی ہوئی ہے

پربت پر حیران سا کھہرا، سکتہ سا میدان پہ طاری — اِن خوابیدہ گیتوں نے بخشی میرے تخیل کو بیداری

میرا مقدر کہلاتی ہیں فطرت کی من مانی باتیں — بجھتے دل، بے رس برساتیں، لٹتی شامیں، اجڑی راتیں

مجھ کو ہوس بے لوث ہنسی کی، قسمت میں اشکوں کے دھارے — فرش پہ آدم کو دے پٹکا، عرش پہ رکھے چاند ستارے

جینا اپنا کھیل تماشا، آئے، بیٹھے، روئے، دھوئے — خار چُنے اور پھول گنوائے، ذرّے پائے، تارے کھوئے

بھور بھئے اُٹھے، دن نکلا — آنکھ ملی، دیکھا، رات آئی — انگڑائی لی، کروٹ بدلی، تارے گنے پر نیند نہ پائی

عشق کیا، یعنی پُر ہیبت طوفانوں میں دیئے جلائے — موتی چننے تہ پر لپکے، اور چٹانوں سے ٹکرائے

پیٹھ پہ بھاری بوجھ اٹھائے، بگڑے، اکڑے، شور مچایا — لیکن دن بھر کی محنت کے بدلے باسی لقمہ پایا

یہ اچھا انصاف ہے تیرا، جو مانگے وہ منہ کی کھائے — جس کے گھر ہو ڈھیروں دولت، تیرے در سے ڈھیروں پائے

پاسِ ادب سے چپ ہوں، ورنہ تیرے جہاں کی خاک اڑا دوں
تارے چُن لوں، چاند بجھا دوں، سورج کا سینہ چٹخا دوں

—

۱۹۴۳ء

معمارِ عالم

(ابلیس کی ذہنیت اقبالؒ کے ابلیس سے مستعار ہے)

[ابلیس اپنے شہپر سمیٹے ایک بہت بڑے شہر کی
بلند ترین عمارت پر کھڑا چار طرف نگاہیں ڈالتا ہے]

خامشی جب در و دیوار پہ چھا جاتی ہے
قلبِ آدم کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

کس قدر تیز ہے اربابِ مشیت کی نظر
بند ہو آنکھ تو احساس کو بہلاتی ہے

دن کو تقدیر کے خنجر سے لگا کر چرکے
مرہمِ خواب سے شب کو انہیں سہلاتی ہے

لیکن انساں کا سنبھالا ہے شکستوں کا ہجوم
مجکو قدرت کی شفقت پہ ہنسی آتی ہے

ابنِ آدم مری نظروں میں سماتا ہی نہیں
مشت بھر خاک سے دبنا مجھے آتا ہی نہیں

افقِ ذہن پہ اوہام کے بادل کڑکیں
چمنِ روح میں تشکیک کے شعلے بھڑکیں

عرش کے گنبدِ سیمیں کا کلس کانپ اُٹھے
اس قدر زور سے بندوں کے کلیجے پھڑکیں

دیکھ زہد کے ریشم میں ریا کے پنجے
جوشِ وحشت سے جہنم کے دریچے کھڑکیں

تجربہ گاہوں میں انسان کو انساں چیرے
خونِ آدم سے جلا پائیں سلیٹی سڑکیں

مرمریں قصر میں دبکے ہوئے بھوتو، جاگو
اے عزازیل کے بے رحم سپوتو، جاگو

(فضا میں چند سائے تیرتے ہوئے آتے ہیں، اور ابلیس کے سامنے
جھک جاتے ہیں، اُن میں سے ایک سایہ جو اپنے وجود کے بے ڈھنگے پن
اور اپنی آواز کی ہیبت کے باعث سب سے ممتاز ہے۔ اور جس کے
ہاتھ میں سونے کی تلوار ہے، کورنش بجا لا کر کہتا ہے۔)

آپ کے حکم کی تعمیل ہے ایماں اپنا — فرضِ اول ہے دل آزاریٔ انساں اپنا
جس نے خود قادرِ مطلق کے تراشے ہیں حریف — کیسے کہتا ہے اُس انسان کو یزداں اپنا
ہم کتر آئے ہیں مذہب کے ستونوں کی جڑیں — کیا بگاڑے گی بھلا گردشِ دوراں اپنا
ثبت ہیں ذرّوں پہ افلاک کی خونی مہریں — بحر اپنا ہے، چمن اپنا، بیاباں اپنا

شاہِ ذی جاہ! تردّد کا یہ ہنگام نہیں
ابنِ آدم کو اب آدم سے کوئی کام نہیں

آپ نے دیکھے ہیں عالم کے زمانے سارے — ٹوٹتے ہیں تو ابھرتے نہیں روشن تارے
ہم نے منعم کے بھٹکتے ہوئے مے خانے میں — بہتے دیکھے ہیں غریبوں کے لہو کے دھارے
ہم نے دیکھے ہیں سیاست کے کھلے آنگن میں — بحث و تکرار کے چلتے ہوئے لاکھوں آرے
چند الجھے ہوئے الفاظ کے سلجھانے کو — بھولی ماؤں نے کئی راج دلارے وارے

ہم نے افکار کو پابند بنا رکھا ہے
ہم نے انساں کو رضامند بنا رکھا ہے

(ابلیس)

خوب ہے! خوب ہے یہ کارگزاری ساری — وسعتِ دہر پہ ہے موت کا عالم طاری

لیکن اس فتنۂ آشوبِ جہاں سے ہشیار
تند ہے جس کا نفس، ضرب ہے جس کی کاری

اُف یہ دہقان — یہ ایوانِ جہاں کا معمار
جس کا وجدان ہے تعلیمِ نوی سے عاری

جس کی پرہول درانتی کے اُٹھے دندانے
میرے احساس پہ کرتے ہیں شرارہ باری

سخت مشکل ہے عزازیل کی قوت کی ثبات
دل یہ کہتا ہے کہ بیدار ہوئی رُوحِ حیات

اس کو افلاس کے نرغے میں پھنسائے رکھو
اس کو تقدیر کا محکوم بنائے رکھو

کھیت پک جائیں تو دھتکار دو کتے کی طرح
اگلے موسم کے تقاضوں سے لبھائے رکھو

قول کو پاک رکھو فعل کی آلائش سے
اس کے ادراک میں اندھیر مچائے رکھو

جن کے فیضان سے مضبوط ہے بدعت کا نظام
اُن روایات کا دیوانہ بنائے رکھو

یہ نہ مانے تو فرنگی کا لہو گرماؤ
ورنہ خود اپنے جہنم میں بھسم ہو جاؤ

۱۹۴۳ء

پھریری

حریمِ دل میں شمعِ اضطراب جل رہی ہے کیوں؟
خلا کی آندھیوں میں اک کرن مچل رہی ہے کیوں؟

فسردگی کے ریگ زار، لالہ زار بن گئے
مرے شکستہ حوصلے طلائی تار بن گئے

ہوا میں کھلبلی مچی، غبار چھپٹ کے رہ گئے
مرے خیال کے کھنڈر الٹ پلٹ کے رہ گئے

سمٹ کے رہ گئی گذشتہ زندگی کی تیرگی
پلٹ کے آ گئی وہی غرورِ فریبِ سرخوشی

تصورات کا کلس فضا میں جھلملا اٹھا
حقیقتوں کا پردۂ حریر پھڑپھڑا اٹھا

خدا کرے یہ اک مذاق ہو مرے شباب کا
کہ کھو چکا ہوں مدتوں سے ذوق انقلاب کا

جہانِ عشق میں ہوس پرستیوں کا زور ہے
جمالِ یار پر دراز دستیوں کا زور ہے

عفونتوں کے ڈھیر ہیں شفق نما جوانیاں
خیال میں نہ رفعتیں، نہ رس، نہ بیکرانیاں

مرے جنوں کو یہ رکاوٹیں نہ راس آسکیں
کہ میری روح کی ستارہ گیریاں نہ جاسکیں

اگر یہ انقلاب بھی اُسی قفس میں بند ہے
تو مجکو اپنے شوق کی شکست ہی پسند ہے

۱۹۴۳ء

معاصر سے

ہو چکا اب ماتمِ تیرہ نصیبی ہو چکا ۔۔۔ دیدۂ پرنم کبھی اشکوں کے تارے کھو چکا

تیرے غم سے سنگ نہادوں کے کلیجے کٹ چکے ۔۔۔ گہرے گہرے ہٹ چکے گنجان بادل چھٹ چکے

قصرِ شاہی کے ستوں اپنی جگہ سے ٹل چکے ۔۔۔ ریشم و دیبا کے ہیبتناک پردے جل چکے

روح کے ساکن سمندر میں تلاطم آ چکا ۔۔۔ زندگی کے مردہ ہونٹوں پر تبسم آ چکا

وہ جہاں بھی آج تیرے ذکر پر مجبور ہے

جو دیارِ ماہ و انجم سے بھی کوسوں دور ہے

سینہ کاوی میں جو لذت ہے مجھے معلوم ہے ۔۔۔ لیکن اس لذت میں ذوقِ ارتقا معدوم ہے

گو ترے افکار تیرے زعم میں آزاد ہیں ۔۔۔ جن عقاید میں تذبذب ہو وہ بے بنیاد ہیں

ذہن میں منزل معین ہو تو بجتا ہے سفر ۔۔۔ ہر قدم پر ورنہ رکتی ہے، ٹھٹکتی ہے نظر

تیرے دل میں عزم کی قندیل جلتی ہے ضرور ۔۔۔ شش جہت میں جھلملاتے ہیں مگر انوارِ طور

وہ جوانی گیند ہے بچوں کی لڑھکائی ہوئی

وہم کے نرغے میں جو پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

گو بہت مدہوش کن ہوتے ہیں منطق کے نکات ۔۔۔ زندگی کو زندگی کہنا ہے عرفانِ حیات

ظلمتوں میں کون دے اس کی تجلی کا ثبوت ۔۔۔ دھوپ میں بیشک چمک اٹھتا ہے تارِ عنکبوت

عشق و مستی، حسن و لذت، ساغر و مے خوب ہیں
مجھکو لیکن بے کسوں کے جھونپڑے مرغوب ہیں

شاعری پہ تو نے ڈالے ہیں نقابِ ابہام کے
شعبدے ہیں میری نظروں میں یہ فکرِ خام کے

شعر کے دھارے ہیں بہ، لیکن نہ یوں رک رک کے بہ
تجھکو کہنا ہے اگر تو برملا کہہ، کھل کے کہہ

تو نے عریانی کو سمجھا ہے حقیقت کا فروغ
یہ حقیقت ہے مگر تیری جوانی کا دروغ

ذہن کی عیاشیوں سے گو بہلتے ہیں دماغ
لیکن ان جھونکوں میں بجھ جاتے ہیں روح و عقل کے چراغ

جسم انساں کا مقدس ہے کہ اس کا احترام
جوش میں بپھرے ہوئے جذباتِ نفسانی کو تھام

زخم کو چھیڑا تو ہے اس کا مداوا بھی تو کر
طبل پر چوٹیں لگا بیٹھا ہے دھاوا بھی تو کر

صرف کہنا ہے تو تلقینِ عمل کرتا ہے کیوں
شاعری کرتے ہوئے ماحول سے ڈرتا ہے کیوں

اے مرے ہمدم مرے ساتھی مرے ہمراز سُن
شاعری کے ساز کی میٹھی ہوئی آواز سُن:

زخمہ و۔ اب انگلیوں کی تیزیاں کس کام کی
ابتدا میں سُن رہا ہوں ہچکیاں انجام کی

نفس کی تحلیل کر، یا عشق کی پھبتی اُڑا
ہے ترے نامے کی ہر جنبش میں اندازِ بکا

یہ ترے نغمے ہیں یا تقلید کے جنات ہیں
گیت ہیں تیرے کہ سر دھنتے ہوئے ذرات ہیں

اس قدر حساس ہو کبھی یہ مستی! قہر ہے
انفرادیت نہ کھو، ورنہ جوانی زہر ہے

ہم نے ایسے وقت میں تھاما بغاوت کا علم
جب جلا لیتا ہے قندیلِ عمل صدیوں کا غم

ہم نے ایسے وقت میں جانچے ہیں فطرت کے اصول
نوجواں جب زر کے بدلے آگ کرتے ہیں قبول

چھٹ گئی ہیں یک بیک اوہام کی دھندلاہٹیں
آ رہی ہیں ہر طرف سے زندگی کی آہٹیں

نیم وا آنکھیں ہیں، اور انگڑائیوں کا زور ہے!
کون قصّاں ہے یہ کس کی جھانجھنوں کا شور ہے!

ہم اگر اب بھی حقیقت کی حقیقت جان لیں
کیا عجب ہے اس تڑپ کی مصلحت پہچان لیں

۱۹۴۳ء

سوانگ

انہی قریوں کی عفونت سے بھری گلیوں میں
جذب ہوتا ہے اسی خاک میں دہقاں کا لہو
پرورش پاتا ہے قوموں کی معیشت کا نظام
یعنی بنتا ہے تمدن کے خداؤں کا قوام

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
کبڑے کھرپوں سے بناتی ہیں بقا کے زینے
جن کے عارض میں سسکتا ہے زبوں حال شباب
ڈال کر کھاد جوانی کی، اُگاتی ہیں گلاب

انہی کھلیانوں میں لگتے ہیں طلائی انبار
برسوں اک لال سی پوتھی میں پڑی رہتی ہے
جن کی اجرت ہے فقط ایک پرانی تحریر
جتنی فرسودہ ہو۔ بڑھ جاتی ہے اس کی تاثیر

انہی میدانوں میں پلتے ہیں جوانانِ جری
رتیاں بٹتے ہیں اجڑی ہوئی چوپالوں میں
جن کی یلغار سے کٹ جائیں چٹانوں کے جگر
زندگی موت کی امید میں کرتے ہیں بسر

وہ بہت دور، افق پر جو دھواں اُٹھتا ہے
یہ وہی شہر ہے، جو تاک میں رہتا ہے سدا

گدھ کی مانند جھپٹتا ہے لہو پینے کو   چھوڑ جاتا ہے اک انبار سڑے ڈھانچوں کا

کتنا بے درد ہے سرمایہ پرستی کا نظام   اپنے رازق کا لہو پی کے تنا پھرتا ہے

جانے تقدیر کی ہے مصلحت اندیشی کیا

کہ بھکاری بھی شہنشاہ بنا پھرتا ہے

۱۹۴۳ء

قدیم نقّادانِ فن کا پیغام

جدید فنکاروں کے نام

اندھیارے میں رہنے والو! اندھیارے کے راز نہ کھولو
کانچ کے سپنے ٹوٹ نہ جائیں آہستہ آہستہ بولو
زہر نہ بن جائے یہ جینا اس مینا میں نیندیں گھولو

اور خوابوں کے موتی رولو

رقص کی چکراتی لہروں میں بہنے دو ذہنوں کا سفینہ
جام کی خون آلود خلا میں گھلنے دو عرفاں کا نگینہ
بٹنے دو عصمت کا خزینہ، پھٹنے دو احساس کا سینہ

ایک کرو کیوں خون پسینہ

ننگوں کے ننگے پن کی تم ننگی تصویریں نہ بناؤ
کالی کلموہی چیزوں پر غازہ چھڑکو، رنگ چڑھاؤ
چھپ کر ہم جو کچھ کرتے ہیں تم کیوں اُس کو سامنے لاؤ

برخوردارو، ہوش میں آؤ

جانے کیا مقصد ہے تمہارا صاف کہو، ابہام کو چھوڑو
کام نہیں رکتے دنیا کے، جام بھرو، انجام کو چھوڑو
جس میں ناسوروں کی بُو ہو اُس بھونڈے الہام کو چھوڑو
دام ملیں تو کام کو چھوڑو

فرش سے لے کر عرش بریں تک بیٹھا ہے قانون کا پہرا
تم کیوں مفت میں چلّاتے ہو انساں گونگا، سلطاں بہرا
کیسے پار کرو گے سمندر، اتنا چوڑا، اتنا گہرا
وہ ڈوبا جو پل بھر ٹھہرا

داناؤں نے فرمایا ہے مشکل ہے تقدیر سے لڑنا
ناممکن ہے تلواروں کا پربت کی چھاتی میں گڑنا
پکے بیروں کی قسمت میں لکھا ہے شاخوں سے جھڑنا
اور مٹی میں گلنا سڑنا

دیکھو وہ طوفان اُٹھا ہے، بھاگو غاروں میں چھپ جاؤ
ایواں کانپے، چھپر ہانپے، پلٹو پلٹو، آؤ آؤ
منزل کی رٹ بے معنی ہے، رستہ چھوڑو، جان بچاؤ
لاؤ اپنا ہاتھ بڑھاؤ

ٹھانو بھی کچھ اپنے جی میں، مانو بھی یہ بات ہماری
لال آنکھیں کیوں جھپکاتے ہو، جسم پہ کیوں ہے رعشہ طاری
ہاتھوں میں فولاد کی سختی، سانسوں میں کوندے کی دھاری

وہ جاتی ہے راہ تمہاری

۱۹۴۴ء

افشائے راز

تیرے بالوں میں پرونے کو چُنی تھی جو کلی
منجمد قطرۂ خوں تھا مرے ارمانوں کا

جانے کس جبرِ مشیّت سے بگڑ کر میں نے
رُخ کیا تیری جوانی کے شبستانوں کا

تیرے آغوش میں لایا تھا مجھے بیم و خطر
سنسناتے ہوئے، روتے ہوئے ویرانوں کا

امتیازات کے ماتھے پہ یہ مزدور کا نام
ایک دھوکا ہے سیاست کے دبستانوں کا

کیوں کیا فرش کو بھی گردشِ انجم کا غلام
بس اگر عرش پہ چلتا نہیں انسانوں کا

اپنی رفعت کو خلاؤں میں چھپا رکھا ہے
نام بدنام ہے پستی کے ثناخوانوں کا

فلسفہ خاک بسر، شاعری کشکول بدست
کوئی پرساں نہیں فطرت کے نگہبانوں کا

اب کوئی آدمِ نو آئے تو شاید ابھرے
عکس فردوس کی بھولی ہوئی پہچانوں کا

تیرے گیسو کو سنواروں، کہ سنوں واویلا
علم و حکمت کے گرجتے ہوئے طوفانوں کا

میں خیالوں کے لبادے میں تو چھپ سکتا ہوں
ساتھ دینا ہے مگر چاک گریبانوں کا

مجھ کو اب تجھ سے بہت دور لیے جاتا ہے
ایک انبوہ بلکتے ہوئے انسانوں کا

ان کو عرفاں کے چمن زار میں پہنچانے دے
عشق کی منزلِ اوّل سے گذر آنے دے

۱۹۴۴ء

شکست و ریخت

کاروانِ حیات سست قدم
آرزو روح میں اڑانوں کی
بار ہوتی ہے تیسرِ پر جیسے
بے نیازی تنی کمانوں کی

چاند نیلے فلک پہ دم سادھے
دیکھتا ہے تمدّنوں کے نظام
اک طرف صبح کی حنا بندی
اک طرف رنگتی سسکتی شام

ایک بھونڈا سا مرمریں ڈھانچہ
اور نیندوں میں چور سنگتراش
جیسے زرّیں بتوں کے جھرمٹ میں
اک پجارن کی گلتی سڑتی لاش

معبدوں کے اندھیرے گوشوں میں
چند راہب تھکن سے اونگھتے ہیں
جیسے کمہار کی گپھاؤں میں
اژدہے اپنے جسم سونگھتے ہیں

اک فلک بوس محل میں تنہا
سیج پر سو رہی ہے شاہزادی
اور افلاس کے شبستوں میں
بلبلاتی ہے روحِ آزادی

درسگاہوں کے سرخ برجوں پر — بھوکی چمگادڑیں تڑپتی ہیں
پتلی جھلی کی پھڑپھڑاہٹ میں — علم کی بجلیاں کڑکتی ہیں

اک الاؤ کے گرد بیٹھی ہیں — چند چرواہیاں، بجھے مہتاب
ٹھٹھری خاموشیوں میں کھوئے ہوئے — اجڑی پچھڑی جوانیوں کے خواب

تیرہ و تار، تنگ کوچوں میں — رینگتے رُکتے مضطرب سائے
ایک پھنکار سی دریچے سے — "اُس کو لائے، کہ یونہی لوٹ آئے"

ایک جانب سے کانپتی آواز — "جاں لبوں پر ہے رحم فرماؤ"
اک طرف سے صدائے زہرہ گداز — "غلہ آنے کو ہے، جیئے جاؤ"

دیکھتے ہی یہ شرمناک تضاد — چاند بدلی میں منہ چھپاتا ہے
اور انسان پر لہو روتا — کالے غاروں میں ڈوب جاتا ہے

میں کہاں، یہ نظامِ خام کہاں — کیوں نہ رسمِ جہاں بدل ڈالوں
تیر اگر چھوٹتے ہوئے جھجکیں، — یہ پرانی کماں بدل ڈالوں

۱۹۴۴ء

ردِّ عمل

ملتا ہی نہ تھا نقطۂ آغازِ سفر کا
ابہام بدلتا ہی نہ تھا حدِّ نظر کا
تاروں کی نگاہوں میں تقاضا تھا سحر کا

چلنا تھا، مگر سمت معیّن نہ ہوئی تھی
اس دشت میں اک راہ بھی روشن نہ ہوئی تھی
اور روح رضامندِ نشیمن نہ ہوئی تھی،

میں بارگہِ حسن میں اک بار گیا تھا
لیکن یہ سفر بھی مرا بیکار گیا تھا
گو جسم بچا لایا تھا، جاں ہار گیا تھا

باہوں کو بھی سہلایا تھا، بالوں سے بھی کھیلا
ہونٹوں سے بھی بہلا رہا، گالوں سے بھی کھیلا
تاروں پہ جھپٹنے کے خیالوں سے بھی کھیلا

کوہسار کے گاتے ہوئے چشموں میں نہایا
جھونکوں نے مجھے اپنے ہنڈولوں میں جھلایا
اک سانس سے کہرے کی نقابوں کو اڑایا

گاتے ہوئے جھرنے پہ صنوبر کی گھنی چھاؤں
چمٹے ہوئے میدان کی چھاتی سے کئی گاؤں
بڑھتا تھا مرا شوق، لپکتے تھے مرے پاؤں

ہونٹوں کے چھلکتے ہوئے جرعے بھی پیے تھے
آنکھوں کو تپاں ریت کے چھینٹے بھی دیے تھے
پوشاک بھی پہنی تھی، گریباں بھی سیے تھے

ناگاہ ستاروں نے نئے پیچ لڑائے — اڑتے ہوئے انسان کے پر نے نظر آئے
تقدیر کی ڈوریں تھیں اشارے تھے پرائے

فرسودہ سہی کھیل، مگر ڈھنگ نیا تھا — تھے چنگ پرانے مگر آہنگ نیا تھا
گو رنگ وہی تھے مگر اثر رنگ نیا تھا

انداز کی جدت نے توجہ کو سمیٹا — کچھ دیر صنوبر کی گھنی چھاؤں میں لیٹا
پھر عشق کا پشتارۂ بے ربط لپیٹا

خوابوں کی بلندی سے زمیں پر اُتر آیا — ہر ذرے میں دبکا ہوا اک دل نظر آیا
ہر نقش میں صانع کا کلیجہ ابھر آیا

چہروں پہ تجلی تھی، نگاہوں میں پکاریں — ہونٹوں پہ تھیں افسردہ پژمردہ بہاریں
گالوں پہ ہلکتے ہوئے اشکوں کی قطاریں

سہمی ہوئی سمٹی ہوئی پھرتی تھی جوانی — سڑتی ہوئی صدیوں کے تعفّن کی نشانی
تاریخ کی روداد مزاروں کی زبانی

پازیب میں زنجیر کے اُٹھتے تھے چھناکے — گیتوں میں امنگوں کے چٹخنے کے دھماکے
آنکھیں تھیں کہ فنکار کے بگڑے ہوئے خاکے

ہر بات میں فریاد تھی، ہر سانس میں نالہ — ہر گام پہ حائل تھا رواجوں کا شوالہ
جکڑے ہوئے ہر عزم کو اخلاق کی مالا

کھیتوں کی نگہباں تھیں بگڑی ہوئی لاشیں   ناسُور تھے سینوں پہ تو باہوں پہ خراشیں
چھٹکے ہوئے مہتاب کی بجھتی ہوئی قاشیں

ہر پھول کو حاکم نے بنایا تھا شرارہ   اور وہم یہ ہوتا تھا کہ ابھرا ہے ستارہ
تقدیر بڑے غور سے کرتی تھی نظارا

اک خطّہ اگر کال سے پامال ہوا تھا   اک خطّہ اسی کال سے خوشحال ہوا تھا
مسرور بہت "رندِ کہن سال" ہوا تھا

بارود کے بھبکے میں شرابوں کی مہک تھی   گولوں کی کڑک میں کئی کلیوں کی چٹک تھی
کچلے ہوئے اجسام میں ریشم کی لچک تھی

دیکھی نہ گئی مجھ سے جب آدم کی تباہی   بیدار ہوئی روح کی آفاق پناہی؟
چبھنے لگی فطرت کو مری تیز نگاہی!

حائل تھیں مری راہ میں مذہب کی فصیلیں   آنکھوں پہ جھپٹنے لگیں قانون کی چیلیں
ڈسنے لگیں اخلاق کی بے رحم دلیلیں

بھٹکتا رہا لیکن میں فضاؤں میں طرارے   لیٹے مرے ملبوس سے جلتے ہوئے تارے
تقدیر کھڑی ہنستی تھی سورج کے کنارے

پرشور ہوا نے مجھے بے طرح اچھالا   سو بار شبستانِ مشیّت سے نکالا
لیکن مجھے احساس کی شدّت نے سنبھالا

مستقبلِ آدم کی سیاہی کو اُڑایا ناسور کو نابود کیا۔ پھول بنایا
گردوں کو مساوات کے محور پہ گھمایا

ہر لوح کی تحریر لہو گھول کے دھو دی آنکھوں کی تجلّی نئے لفظوں میں سمو دی
یہ دیکھ کے تقدیر بھی منہ ڈھانپ کے رو دی

اب میرا جہاں حسن و جوانی کا جہاں ہے مقصد مرا اب خواجگیٔ کون و مکاں ہے
اے جبرِ مشیت! ترا قانون کہاں ہے؟

۱۹۴۴ء

———

دیہات کی شہزادی

سورج نے ادھوری سی جب ایک جماہی لی　　فطرت نے نظاروں سے محجوب نگاہی لی

پچھم نے شفق پائی، پورب نے سیاہی لی

آکاش کے پٹ کھولے زرباز ستاروں نے　　نیندوں کے نشے چھڑکے جنت کی بہاروں نے

خوابوں میں پناہیں لیں پرشور دیاروں نے

چپ چاپ خلاؤں میں ظلمت نے علم کھولے　　سوچوں کے سمندر میں آنے لگے ہچکولے

احساس کے پنچھی نے بھیگے ہوئے پر تولے

مدہوش سی پگڈنڈی، خاموش سی چرواہی　　راہوں سے شناسائی، ماحول سے آگاہی

ہاتھوں میں درانتی اور قدموں میں شہنشاہی

آنکھوں کے کٹوروں میں دوشیزہ امنگیں ہیں　　باہوں کے لپکنے میں تاروں کی ترنگیں ہیں

رفتار میں مستی اور پرواز کی جنگیں ہیں

اٹھتی ہیں کبھی نظریں، جھکتی ہے کبھی گردن　　اڑتے ہیں کبھی کاکل، گرتا ہے کبھی دامن

بلور کی چوڑی سے بجتا ہے کبھی کنگن

کاؤں کے قریب آکر باہوں کو سمیٹے گی — چہرے کے خزانے کو آنچل میں لپیٹے گی

سو جائے گی۔ آنگن میں جب کھاٹ پہ لیٹے گی

جب صبح کو چڑیوں کی آواز سے جاگے گی — بھیڑوں کو نکالے گی میدان کو بھاگے گی

نوخیز جوانی کی آسائشیں، تیاگے گی

کھیلے گی شعاعوں سے لپٹے گی ہواؤں سے — تھپکائے گی دھرتی کو جھانجھن کی صداؤں سے

خلوت کو سجائے گی گیتوں کی رداؤں سے

سورج کے بچھڑتے ہی انگڑائیاں آئیں گی — تاروں کی نئی شمعیں شہراہ دکھائیں گی

اور تیز گیاں اس کو سوتا ہوا پائیں گی

دیہات کی شہزادی جنگل کی مہارانی — یہ رنگِ شہنشاہی یہ بے سرو سامانی

تصویر ہے نورانی۔ تقدیر ہے حیرانی

میں تیری تسلی کو آزار سمجھتا ہوں — میں تیری جوانی کو بیمار سمجھتا ہوں

میں گاؤں کو بابل کا بازار سمجھتا ہوں

تو اصل میں منعم کی شطرنج کا مہرہ ہے — تو تیرہ خلاؤں میں بھٹکی ہوئی زہرہ ہے

برسے ہوئے بادل کا بیٹھا ہوا کہرا ہے

تو صید ہے قانون و مذہب کے شغالوں کا — تو کھیل ہے شہروں کے خورشید جمالوں کا

تو ایک ذریعہ ہے سائنس کے کمالوں کا

بجتی ہیں تری آنکھیں سجتا ہے شباب اُن کا رُکتی ہیں تری نبضیں، بجتا ہے رباب اُن کا
لُٹتی ہے تری جنت، اُگتا ہے گلاب اُن کا

کب تک تری دنیا کو لوٹے گی شہنشاہی کب تجھ کو ستائے گی تقدیر کی کوتاہی
کب تیرے خیالوں میں تڑپے گی خود آگاہی

وہ دیکھ فضاؤں میں دوزخ سے بھڑکتے ہیں کوندے سے لپکتے ہیں، بادل سے کڑکتے ہیں
محلوں میں تباہی کے آثار دھڑکتے ہیں

برسوں کے تعفن کو اب وہ ہر جھٹک دے گا افسردہ امنگوں کو کلیوں کی چٹک دے گا
کانٹوں کو مہک دیگا، پھولوں کو چمک دے گا

خاکسترِ ماضی میں ہنگامۂ محشر ہے اب گلشنِ فردا کا بدلا ہوا منظر ہے
اب دستِ مشیت میں انصاف کا نشتر ہے

اب اپنی حقیقت کو پہچان مری رانی اب خواب کا پرتو ہے صدیوں کی پریشانی
تصویر بھی نورانی — تقدیر بھی نورانی

۱۹۴۴ء

رفتارِ زمانہ

خیالات کے دھندلے دھندلے افق پہ کوئی چاند جلوہ نما ہو رہا ہے

امیدوں کی اُجڑی ہوئی وادیوں میں کوئی شوخ نغمہ سرا ہو رہا ہے

شہنشاہوں کی مرمریں بارگاہوں میں فانوس روشن ہوئے جس کے خوں سے

مشیت کے الجھے ہوئے راستوں سے وہ مفلس بھی آشنا ہو رہا ہے

تمدن کی قربان گاہوں پہ بے رنگ لاشیں نشانِ سفر بن رہی ہیں

حکومت کے پنجے میں محبوس و مجبور نالہ، صدائے درا ہو رہا ہے

سرور اور مستی کی جنت میں کب تک میں انگڑائیوں کے ہیولے بناؤں

کہ اجداد کی خاک کا ذرہ ذرہ مرے چار سو لب کشا ہو رہا ہے

رگِ سنگ میں زندگی پھڑپھڑائی، چٹانیں اڑیں، اور ٹکرا کے ٹوٹیں

وہ آئینہ خانوں میں اک شور اُٹھا، یہ کیوں ہو رہا ہے یہ کیا ہو رہا ہے

جسے چند محتاط تاریخ دانوں نے مذہب کا اندھا تعصب کہا تھا

زمانے کے دربار سے مفلسوں کو وہ جذبِ دروں پھر عطا ہو رہا ہے

وہ کافر نگاہی! — یہ رنگیں نوائی! — کسی مصلحت کی ہے معجز نمائی

جسے طفلِ مکتب کہا جا رہا تھا، وہی قابلِ اعتنا ہو رہا ہے

وہ بیلیں، جو ایوانِ شاہی کے ٹوٹے ہوئے گنبدوں کو چھپاتی رہی ہیں

اب اُن کے لپٹنے، لپٹ کر تڑپنے کا انداز، اژدر نما ہو رہا ہے

غزال اپنے صحرا کے زنداں سے نکلے، پہاڑوں میں گھومے، سمندر میں جھانکے

اسی ولولے کے ہیں چرچے جہاں میں، یہی تذکرہ جا بجا ہو رہا ہے

۱۹۴۴ء

راستے کا موڑ

خیال و خواب کی دنیا سے بھاگ آیا ہوں جوانیوں کے چمن زار تیاگ آیا ہوں
میں بن کے راگ گیا، ہو کے آگ آیا ہوں

شفق میں ڈوبے ہوئے پربتوں پہ گھوم چکا ہوا میں کھوئی ہوئی راگنی پہ جھوم چکا
گلوں کے بھیگے ہوئے عارضوں کو چوم چکا

کبھی شباب کی تنہائیوں پہ رویا ہوں کبھی سلگتے ہوئے بازوؤں پہ سویا ہوں
اب اپنے ذہن کی پرچھائیوں کا جویا ہوں

یہ زندگی ہے، کہ حبسِ دوام ہے ہمدم قدم قدم پہ پرستش کا دام ہے ہمدم
یہ داستان ابھی ناتمام ہے ہمدم

جوان ہوں، مگر احساسِ خود شناس نہیں اداس ہوں، مگر اس کی کوئی اساس نہیں
بایں ہمہ یہ سکونِ دوام راس نہیں

رواج و رسم میں بٹتا رہا خیال مرا دل و دماغ میں گھلتا رہا کمال مرا
حصارِ جبر میں لٹتا رہا جمال مرا

جو کہنا چاہوں تو میری زباں پہ پہرے ہیں جو کہہ بھی دوں تو مرے سامعین بہرے ہیں
جو کہہ چکوں تو سلاسل ہیں اور کٹہرے ہیں

مقابلے میں اُدھر زور آزمائی کے ادھر گلے ہیں مشیت کی کج آرائی کے
سمجھ میں آ نہ سکے راز کبریائی کے

وہاں فضاؤں میں شعلوں کے تن رہے ہیں جال یہاں پڑے ہیں گزرگاہوں پر غریب کے لال
وہ زندگی کے مجاہد، یہ زندگی کے وبال

اُدھر امنگ کہ پہنائی زمانہ ملے ادھر پکار کہ چاول کا ایک دانہ ملے
سبھی حصول کے ظلمات کو روانہ ملے

میں شاہراہوں پہ لاشوں کے ڈھیر دیکھ چکا میں رقص گاہوں میں لاکھوں کو سیر دیکھ چکا
میں اس تضاد کے سب ہیر پھیر دیکھ چکا

مجھے نشیب و فرازِ جہاں سے شکوہ ہے عدم میں بھٹکے ہوئے کارواں سے شکوہ ہے
الٰہی! تجھ سے، ترے لامکاں سے شکوہ ہے

یہ مصلحت مرے ادراک سے نہاں کیوں ہے؟ ترا سکوتِ پر اسرار بیکراں کیوں ہے؟
نگاہِ برق میں میرا ہی آشیاں کیوں ہے؟

بس اب الٹ کے رہونگا یہ پردہ ہائے قدیم کہ عام ہو نہ سکی تیری رحمتوں کی شمیم
کوئی پکار رہا ہے مجھے — ندیم! ندیم!

میں آرزو کو حقیقت بنا کے دم لوں گا میں اپنی خاک سے نکہت بنا کے دم لوں گا
ترے جہاں کو جنت بنا کے دم لوں گا

مجھے تو دیکھ! مرے لشکر و سپاہ نہ دیکھ میرے چراغ تو گن اپنے مہر و ماہ نہ دیکھ

مجھے بُلا تو سہی! اوجِ بارگاہ نہ دیکھ

تیری ہی دین سہی قوتِ ستارہ شکار سلگ رہا ہے مگر میرا عزمِ طور آثار

مرا کلام ہے میری تڑپ کا آئینہ دار

میں خود ہی اپنا مقدر بدلنے نکلا ہوں شرر ہوں اور جہنم نگلنے نکلا ہوں

مقامرو! میں نئی چال چلنے نکلا ہوں

میں آدمی ہوں، بہشتوں کے راز جانتا ہوں میں خاص خاص فرشتوں کے راز جانتا ہوں

میں ان حجاب سرشتوں کے راز جانتا ہوں

اک آفتاب نہفتہ شبِ سیاہ میں ہے نئی زمین نیا آسماں نگاہ میں ہے

یہ شعبدہ میرے احساس کی پناہ میں ہے

عمل کے دشت میں جب عزم دندنائے گا افق پہ نجمِ سحر جب نقاب اُٹھائے گا

تو میری شعلہ مزاجی کو چین آئے گا

جب اپنے قصر میں اپنا دِیا جلاؤں گا جب اپنے کھیت کا پھل آپ ہی اٹھاؤں گا

خیال و خواب کی دنیا کو لوٹ جاؤں گا!

۱۹۴۴ء

شفق

ہر نئی پود نے اک تازہ صنم ڈھال لیا
نت نئے بُت، نئے مندر، نئے پوجا کے اصول
سنکھ بجتے رہے، جلتے رہے رنگیں فانوس
روح گھلتی رہی، ہوتا رہا انسان ملول

قصرِ شاہی سے گرائے گئے نیلم، پکھراج
سنگ ریزوں کو نگلتے رہے مجبور عوام
خشک کانٹوں میں بدلتے رہے خیرات کے پھول
سوکھے جبڑوں کو جکڑتی رہی زرتار لگام

حسن بکتا رہا زربفت کے پردوں سے اُدھر
عشق سنتا رہا بجتے ہوئے فولاد کا شور
قافلے لٹتے رہے، منزلیں بیگانہ رہیں،
چاند بجھتے رہے، تکتے رہے محبوس چکور

ہر نیا دور صد امید بداماں آیا
زندگی خستہ و درماندہ و مجبور رہی
اک شہنشاہ اُٹھا، ایک شہنشاہ بڑھا
اِسی چکر میں ازل سے یہ زمیں چور رہی

ناگہاں ایک دھواں دھار دریچہ کھٹکا   شوخ سی شمع بڑھی، لَو کی زباں لہراتی
سرسراتی ہوئی ظلمت کے نشیبوں سے اٹھی   شفقِ سرخ نئی صبح کے نغمے گاتی

اک نئے دور کا پرتو ہے افق کی لالی   اک نئے حسن کی خاطر یہ حنا بندی ہے
ایک ہی سطح پہ اُترے ہیں نشیب اور فراز
اب کس انسان کو دعوائے خداوندی ہے

۱۹۴۴ء

ماہتابِ فردا

شام افسردہ و پژمردہ سہی

میں تو محرابِ افق دیکھ رہا ہوں ہمدم
ایک دھندلی سی تجلی کا وہ موہوم سا خم

بیکراں چرخ میں آزردہ سہی

اک دمکتی ہوئی انگڑائی کی تمہید تو ہے
عزمِ تجدید تو ہے

عزم یہ تیرے لئے مردہ سہی

آ گیا وہ مرا معبودِ کہن

سرمئی جھیل پہ تاروں کے سفینے کھیتا
شام کے عارضِ شب رنگ کے بوسے لیتا

ڈالتا چہرۂ ظلمت پہ شکن

میں اسے گردشِ ایام کا گرداب کہوں
یا وہ مہتاب کہوں

میرے فردا پہ جو ہے عکس فگن

اب تو ہر شے ہے برافگندہ نقاب

یہ کسی شوخ کے گلنار لبوں کی محراب
یہ تبسم کی چکا چوند، یہ گالوں کے گلاب

نیم وا آنکھوں میں نظروں کی شرر
یہ سمٹتی ہوئی باہوں میں لپٹنے کی امنگ
آتے جاتے ہوئے رنگ

یہ تقاضوں کا حیاؤں سے خطاب

مہِ تاباں مرے فانوسِ خیال
اپنی کرنوں کو ذرا اور بکھر جانے دے
تیرہ و تار گپھاؤں میں اُتر جانے دے

تیرا پرتو ہو اگر شاملِ حال
اپنا جینا کسی جبّار کا مرہون نہ ہو
زیست کا خون نہ ہو

اے مری مشعلِ ترتیبِ جلال

۱۹۴۵ء

———

کل اور آج

کل تو ہر گام پہ منزل کا گماں ہوتا تھا
آج ہر منزلِ دشوار ہے پیغامِ رحیل

کل ہر انکار تھا گستاخی و دہر آشوبی
آج ہر لغزشِ پا عظمتِ آدم کی دلیل

کل سلاطیں کا اجارہ تھا سیاست بازی
آج قانون کی تشکیل کا دہقاں ہے کفیل

کل جہاں قتل کے فرمان لکھے جاتے تھے
آج وہ اوج ہے جمہور کی نظروں میں ذلیل

کل جو بھڑکائی تھی نمرودِ ملوکیت نے
آج وہ نارِ جہنم ہے گلستانِ خلیل

کل تو قابیل کی ہیبت تھی دلوں پر طاری
آج آنکھوں میں اتر آیا ہے خونِ ہابیل

کل فرنگی کا رُخِ سرخ تھا معیارِ جمال
آج زنگی بھی ہے اللہ کی تخلیقِ جمیل

کل تھے بے مایہ سے نالے وطنیت کے نشاں
آج ذہنوں میں نہ دجلہ ہے نہ گنگا ہے نہ نیل

کل تھی جس بحر کے ساحل کی کولمبس کو تلاش
آج وہ بحر ہے سمٹی ہوئی سکڑی ہوئی جھیل

کل فقط کاکل و رخسار سے تھی فکرِ حسیں
آج مزدور کی تاریخ بھی ہے ذکرِ جمیل

کل جو آدم پہ کئی آفتیں بن کر ٹوٹے
آج اُن احکام کی کرتی ہے مشیت تعمیل

آج اُس اوج پہ انساں ہے جہاں تک نہ اٹھا
بالِ جبریل کا کیا ذکر ــــــ خیالِ جبریل

۱۹۴۵ء

نئی بغاوت

ایک بار اور بھی برسے گا چھما چھم بادل
ظلمت آبادِ جہاں کا کلیں چھٹکائے گا
ایک بار اور بھی تقدیرِ زمیں چمکے گی
مثلِ نجمِ سحر انساں کی جبیں دمکے گی

نا تراشیدہ بتوں کے ہیں یہ کہسار انبار
ان دلآویز ہواؤں میں حسیں گاؤں میں
یہ کھلے دشت امیں ہیں کئی گلزاروں کے
کتنے خاکے ہیں مچلتے ہوئے مہ پاروں کے

ابھی انساں کو مشیت کی خدا بندی میں
ابھی تخئیل کی پرواز پہ ایماں بن کر
نظر آتا ہے لہکتا ہوا ہابیل کا خوں
خندہ زن رہتا ہے غمّاز فرشتوں کا جنوں

ابھی تقدیر کی زلفوں کے وہی کس بل ہیں
ابھی ذہنوں پہ ہیں تقدیس کے کابوس سوار
ایک لٹ بھی ابھی ادراک کی باہوں پہ نہیں
اور نگاہیں ابھی شاداب گناہوں پہ نہیں

ابھی تاریخ کی ہیبت ہے دلوں پہ طاری
یہ جھناکے سے جو ہوتے ہیں شفق زاروں میں
ابھی انساں سے شہنشاہ کا رتبہ ہے بلند
قصرِ فردا میں تھرکتے ہوئے رقاص ہیں چند

ابھی اوطان میں محبوس ہے آدم کا شرف
مردہ ہے دل ابھی، افسردہ ہے احساس ابھی
تجربہ گاہِ فلک میں — کوئی دن جاتا ہے
اک نئے ڈھنگ سے ترشے گا یہ الماس ابھی

ایک بار اور بھی ٹوٹے گا عناصر کا جمود
ایک بار اور بھی آدم کو ملے گا بن باس
ایک بار اور بھی شیطاں کی بغاوت ہوگی
ایک بار اور بھی بھٹکے گا وہ اسرار شناس

۱۹۴۶ء

ہمسنوں سے!

فسردہ رخو، بے لبو، بے قرارو / بس اب سر سے پشتارۂ غم اتارو

بھلا عرصہ گاہِ حقیقت سے کب تک / ہراساں رہو گے مرے شہ سوارو

دہکنے کے بعد اب جھپٹنا بھی سیکھو / فرنگی کے اے بھولے بھالے شکارو

نئی کونپلیں منتظر ہیں تمہاری / خزاؤں کے زنداں سے نکلو بہارو

ابھی حسن تکتا ہے رستہ تمہارا / جوانی کی اے مضمحل یادگارو

زمانے کی یہ وسعتیں ہیں تمہاری / بیاباں نصیبو، غریب الدیارو

سنبھل کر چلو، متحد ہو کے لپکو / جوانوں کی اے ٹیڑھی بینکی قطارو

پہاڑوں کی رفعت فریبِ بصارت / یہ انبارِ خاشاک ہے اے شرارو

ستاروں کے بعد اب دلوں میں بھی جھانکو
جواں شاعرو، شوخ جادو نگارو

اُدھر تن کا پربت اِدھر من کا صحرا / یہی ہے کڑا موڑ مغرب کے دھارو

ہوائیں ابھرنے کو ہے سقفِ آہن / سنو تو ہٹو، راستہ دو سہارو

ہمیں کیا سکھاؤ گے تہذیب، جاؤ   تم اپنے تمدن کا لاشہ سنوارو

یہاں سے وہاں تک ہماری حکومت

یہاں سے سدھارو، وہاں سے سدھارو

چھٹو اے عقیدوں کی مبہم گھٹاؤ   ہٹو اے رواجوں کے مردہ وقارو

پلٹ آؤ اے لامکاں کے خیالو   سمٹ جاؤ اے دو جہاں کے کنارو

سما جاؤ جمہور کی آندھیوں میں   شہنشاہیت کے سنہری غبارو

ٹھٹک کر وہ کچھ سوچتا ہے زمانہ!

ندیم اب بلاؤ، ندیم اب پکارو

۱۹۴۶ء

سمندر پار کے "فرشتہ ہائے رحمت" سے

(وزارتی مشن ۱۹۴۶ء کی واپسی پر)

عذابِ جاں تھا اگر مملکت کا استقلال
تو کیا ضرور تھے ہنگامہ ہائے گفت و شنید
معلّمینِ سیاست! تکلفات ہیں یہ
کہ خود شناس ہے انسانیت کا دورِ جدید

نہ جانے کب سے یہ طفلانہ کھیل جاری ہے
تمہاری "عقدہ کشائی" ــ ہماری محرومی
مذاق پر اتر آتی ہے جب شہنشاہی
تو اپنے آپ کو پہچانتی ہے محکومی

تمہارے ذہن کی یہ موشگافیاں ہی تو ہیں
کہ حریت کی خرید و فروخت ہے دشوار
خزاں کے بعد یقیناً بہار آتی ہے
نہیں ہے عادتِ فطرت کو مصلحت درکار

مورخوں سے کہو۔ خون میں ڈبوئیں قلم
بدل چکا ہے ارادے میں اضطراب اپنا
خزاں رہے کہ بہار آئے، ہرچہ بادا باد
اب اک زقند کا ہے منتظر شباب اپنا

۱۹۴۶ء

عقیدے

اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے ـــــ

کون نکلے گا! کہاں نکلے گا!
بیکراں رات، ستارے نابود
چاند اُبھرا ہے؟ کہاں اُبھرا ہے؟
اک فسانہ ہے تجلّی کی نمود،
کتنے گنجان ہیں اشجارِ بلند
کتنا موہوم ہے آدم کا وجود

مضمحل چال ـــ قدم بوجھل سے
اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے ـــ

مجھ کو سوجھی ہے نئی راہِ فرار
آہن و سنگ شرر برسائیں
آؤ اشجار کی بنیادوں پر

تیشہ و تیغ و تبر برسائیں
اک تسلسل سے ہم اپنی چوٹیں
بے خطر بارِ دگر برسائیں

ذہن پر چھائے ہوں کیوں بادل سے!
اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے —
نوعِ انساں کو نکلنا ہوگا
ان اندھیروں کو نگلنا ہوگا

۱۹۴۶ء

———

خون

شفق، شراب، شرارہ، گلاب، گال، گلال،
یہ سب کبھی مری فن کاریوں کا غازہ تھے
انہیں سے میں نے حقائق کی تلخیاں دھوئیں
انہیں سے رنگ مری شاعری کے تازہ تھے

شباب میرے ترانوں کی شوخ سرخی تھی
مری نظر میں صداقت بھی تھی شراب آلود
مگر ندیم — یہ کتنی کڑی حقیقت ہے
کہ میرے ذہن کی انگڑائیاں تھیں خواب آلود

مری نگاہ شبستانِ یار پر تو پڑی
مگر وہیں سے پلٹ آئی لڑکھڑاتی ہوئی
نہ پا سکی وہ اٹل، وہ عظیم سچائی
رواں ہے جو دلِ انساں میں سرسراتی ہوئی

شفق، شراب، شرارہ، گلاب، گال، گلال
یہ رنگ پھیکے ہیں، مجھ کو نہ تھا مگر معلوم
اک اور رنگ ہے جو رنگ بھی ہے نور بھی ہے
بغیر اُس کے شباب و نگار سب معدوم

سنور چکی ہے اسی رنگ سے عروسِ حیات
یہی سنگار اب اک اور رنگ لائے گا
پھٹے گا قلبِ زمیں، ہلبلا اُٹھے گا لہو
زمانہ چاہے گا لیکن اماں نہ پائے گا

۱۹۴۶ء

ناگزیر

دریچوں میں جالے جھروکوں میں سائے، ستونوں پہ دھبّے چھتوں پر دھند لکے
ہوا میں مچلتے ہوئے سے اندھیرے، کہیں گہرے گہرے، کہیں ہلکے ہلکے
اِدھر مرمریں فرش کی اکھڑی اکھڑی سِلوں پر ہیں قرنوں کی چوٹیں نمایاں
اُدھر آئینہ رنگ دیوار پر ہیں خراشوں کی صورت میں صدیوں کے عنواں
یہاں دھول پر چند کیڑوں نے لکھی ہے تاریخِ ماضی انوکھی زباں میں
وہاں اک ممولے کے پنجوں کی دھاری۔ گری پتیاں جیسے آبِ رواں میں

دریچوں میں پردے، جھروکوں میں شمعیں، ستونوں پہ روغن، چھتوں پہ اُجالے
کھلے تذکرے زلف و رخسار و لب کے، ڈھلے قہقہے جیسے روئی کے گالے
یہ ملبوس کی سلوٹوں میں، ہوا میں، فضا میں رواں ایک گمبھیر خوشبو
یہ باہوں میں جکڑے ہوئے نرم پیکر، لچک جیسے کونپل، لپک جیسے آہو
اِدھر مرمریں ساغروں میں مئے ناب رقصاں ہے جیسے گلابی سویرا
اُدھر آئینہ رنگ دیوار پر ہے کسی اجنبی مملکت کا پھریرا

اگر وقت، سورج کی زرکار بہلی کو صرف ایک پل کے لئے روک سکتا!
اگر یہ جہاندیدہ کاہن کبھی انقلابات کا راستہ ٹوک سکتا!
لپکنا مگر اس کی تقدیر میں ہے، پلٹنا بھی دشوار تھمنا بھی مشکل
یہ راہی قیامت میں سستا سکے گا، ازل اس کی نگری، ابد اس کی منزل
اگر وقت کی شاہراہیں معیّن ہیں۔ یہ شام، یہ شب، یہ پَو، یہ سویرا
تو دہکے ہوئے سرخ پہیوں کے چکر میں جل جائے گا اجنبی کا پھیرا

۱۹۴۶ء

اشعار

یہ چند خام پھپھولے ہیں قلبِ گیتی کے	یہ تیری قوم کے اسلاف کے مزار نہیں

•

مرید کے لب پہ پپڑیاں ہیں تو پیر دعوت اُڑا رہا ہے	حقیقتوں پہ ہے نزع طاری فریب اٹھلاتا جا رہا ہے

•

قیامت بھیج دے کچھ روز پہلے	اگر کٹتا نہیں دورِ غلامی

•

خجل اس سے سکندر کی فتوحات	جو بازی جیت لی جاتی ہے ہر کر

•

قدیم نغموں کا سحر برحق غلط نہیں میری راہ لیکن	نئے ترانے سنا رہا ہوں کہ آ گیا ہے نیا زمانہ

•

نوجواں سینوں میں مستقبل کی کرتا ہوں تلاش	مقبروں میں ڈھونڈتا ہوں گذرے وقتوں کے قدم

•

مری نظر میں ہے لعنت وہ فقر و درویشی	جو ضیغموں کو سکھائے خصائلِ میشی
مجھے غنیم کے سر کاٹنے کا سودا ہے	ترے خیال میں ہے ورد کی کمی بیشی

پا در آتش کیوں ہو میرے نعرۂ مردانہ سے
اے غلامو لطفِ خواب اچھا ہے یا احساسِ خواب

•

غضب غضب! کہ رہا حرب و ضرب جن کا کام
وہ چلّہ کش ہیں زمیں دوز مقبروں میں مقیم

•

اے حریر و پرنیاں پر سونے والے لیڈرو
ہند کے سوکھے ہوئے کھیتوں کو پانی چاہیے

•

یورپ نے بھاپ، اور دھوئیں کو خدا کہا
اب اُس کی شرحِ صدر کا ساماں کریں گے ہم

•

کیا زمانے کے نئے بُت نہیں دیکھے تم نے
کہ سناتے ہو مجھے لات و ہبل کی باتیں

•

دلِ آدم پہ اک ناسور ہے جن کی جہانبانی
میں اُن انساں فروشوں کا ثنا خواں ہو نہیں سکتا

•

ترے وجود سے شرمندہ ہے ضمیرِ وجود
وہ نیزہ نیزہ نہیں جو نہ ہو سکا خوں ریز

•

جو مجھ سے پوچھ تو ہے اصل میں ثبوتِ حیات
یہ اضطرابِ مسلسل، یہ شورِ رستاخیز

•

غزلیں

دلِ یاراں ز نواہائے پریشانم سوخت
من ازاں نغمہ تپیدم کہ سرودن نتواں

(پیامِ مشرق)

رک گئی عقل و فکر کی پرواز — جب نمایاں ہوئے نشیب و فراز
میں کہاں تک چھپاؤں راز ترا — جب ترے ناز ہیں ترے غماز
خم بہ خم پھیلتی ہی جاتی ہے — شاہدِ آگہی کی زلفِ دراز
کتنا تاریک ہے مرا انجام — کتنا موہوم ہے مرا آغاز
میری بربادیوں کے راز نہ پوچھ — راز کا انکشاف بھی ہے راز
نیلگوں آسماں کے محلوں سے — دے رہا ہے مجھے کوئی آواز
رفعتیں بھی انہیں کی جویا تھیں
بے محل تھی ندیم کی پرواز — ۱۹۳۶ء

اب تو ہیں اُس شوقِ گستاخانہ سے بیگانہ ہم — بس نظر سے چوم لیتے ہیں لبِ پیمانہ ہم
رات کو تاروں سے، دن کو ذرہ ہائے خاک سے — کون ہے جس سے نہیں سنتے ترا افسانہ ہم
ضبط کی حد سے اگر شوقِ فراواں بڑھ چلا — آنسوؤں سے بھر کے پی جائیں گے اک پیمانہ ہم
یہ اندھیری رات، یہ بوسیدہ کٹیا، اور آپ! — کاش پلکوں پر اٹھا سکتے چراغ خانہ ہم
کچھ ہماری تیرہ روزی کا بھی درماں کیجیے
آپ کی آنکھوں میں پاتے ہیں تجلی خانہ ہم — ۱۹۳۶ء

ہر مسرت سے سرگرانی ہے
کیا یہی عالمِ جوانی ہے

یوں بھی دم تو نکل ہی جائے گا
آپ آئیں تو مہربانی ہے

مسکرانا جسے نصیب نہ ہو
وہ جوانی بھی کیا جوانی ہے

ہے اُن آنکھوں کا رنگ ساغر میں
ورنہ کیا ہے شراب پانی ہے

آ تجھے ایک راز بتلاؤں
میں بھی فانی ہوں تو بھی فانی ہے ۱۹۳۷ء

کدھر اے بے نشاں تیرا نشاں ہے
دلوں میں بسنے والے تو کہاں ہے

ترے حُسنِ فروزاں کی تجلّی
نقاب اُٹھنے سے پہلے رائگاں ہے

محبت کر رہا ہوں جی رہا ہوں،
محبت میں مگر جی کا زیاں ہے

گناہوں کو میں کیوں گن گن کے رو دُوں
تری رحمت اگر اندازہ داں ہے

ہر اک ذرے میں ہے اک طور، لیکن
تری نظروں کا پردہ درمیاں ہے

جو پاسِ ضبط سے ڈر ڈر کے ٹپکا
وہ آنسو چاند سے بڑھ کر گراں ہے ۱۹۳۷ء

میں چھپا چھپا کے رکھتا ہی نہیں مے شبانہ
کہ نہ آئے گا پلٹ کر یہ شباب کا زمانہ

میں قبول کر رہا ہوں ترے واسطے اسیری
میں سمجھ چکا تھا ورنہ یہ فریبِ آب و دانہ

یہ تری تجلّیاں ہیں کہ مری نظر کے دھوکے
تو ادھر ہی مسکرایا میں جدھر ہوا روانہ

کرم اے خدائے غالبؔ میں ہوں درگذر کا طالب
مرے پاؤں زخم خوردہ، ترا پاک آستانہ
مری تیری کیسے بنتی، مری تیری کیسے بنتی
تو ہے ناز میں یگانہ، میں نیاز میں یگانہ
اُسے برق نے نہ چھیڑا، اُسے دام نے نہ روکا
جو ندیمؔ کے مقدر میں لکھا گیا تھا دانہ
۱۹۳۷ء

بیٹھا ہوں تشنگی کو چھپائے نگاہ میں
ساقی کے آستانۂ عالم پناہ میں
پھر عرش و فرش میں ہے قیامت مچی ہوئی
پھر جنبشیں ہیں یار کی نیچی نگاہ میں
خاکِ درِ حبیب پہ جب مجھ کو ناز ہے
پھر کیا دھرا ہے طرّہ و تاج و کلاہ میں
اس ماہِ نیم ماہ کو دیکھا جب اے ندیمؔ
تارے چمک اُٹھے مری لوحِ سیاہ میں
۱۹۳۷ء

رُخِ حبیب پہ جب تک کوئی نقاب نہ تھا
میں اپنے جذبِ محبت میں کامیاب نہ تھا
خدا کے رحم نے تاکا مری خرابی کو،
وہی خراب ہوا جو کبھی خراب نہ تھا
یہ چند روز جو سینے میں اک چمک سی رہی
یہ اک سراب تھا، یا خواب تھا، شباب نہ تھا
یہ اضطراب، یہ جاہ و جلال، یہ پندار
امنگ تھی یہ کسی موج کی، حباب نہ تھا
اسی پہ ناز کرے گی مری فسردہ دلی،
کہ میں حضور کی محفل میں باریاب نہ تھا
ندیمؔ کھیل رہا ہوں خیالِ جاناں سے
ابھی نقاب پڑا تھا، ابھی نقاب نہ تھا
۱۹۳۷ء

جب تیرا ظہور دیکھتا ہوں ، تنکوں میں غرور دیکھتا ہوں
تاریکیٔ شب ہے ہو کے مانوس اب نور ہی نور دیکھتا ہوں
جب سے ہیں قریب ہوں تمہارے ہر چیز کو دور دیکھتا ہوں
یہ کس کے ظہور کی خبر ہے ہر ذرے میں طور دیکھتا ہوں
پلکوں سے نظر نہیں نکلتی جب تیرے حضور دیکھتا ہوں

بے فکر ندیم کو شبوں میں
افکار سے چور دیکھتا ہوں ۱۹۳۸ ء

نوکِ مژہ سے اشک ڈھلے ، اور بہ گئے اک داستان چند اشاروں میں کہہ گئے
رکنے کا نام تک نہ لیا اہلِ شوق نے دم لینے کو جو بیٹھے ، وہ بیٹھے ہی رہ گئے
آنے کا اتنی دور سے کچھ مدعا تو تھا دیوانے خامشی میں کوئی بات کہہ گئے
چوٹیں تو سخت تھیں یہ اسیرانِ غم نصیب سب کچھ ترے کرم کے بھروسے پہ سہہ گئے
سیلِ حیات میں ہیں ہم انسان خار و خس موجوں سے چند لمحہ لڑے ، اور بہ گئے

اہلِ ہوس تو پی کے چلے بھی گئے ندیم
اور آپ دستِ ناز کا رُخ تکتے رہ گئے ۱۹۳۸ ء

تم بھی میرے حال پر ہو نوحہ خواں | شمع پروانے کو روئے! الاماں!
یہ ترے پندار کی توہین ہے | کون کہتا ہے تجھے آرامِ جاں
یہ محبت، یہ عذابِ زندگی | میں اٹھا لیتا ہوں ہر بارِ گراں
قعرِ دریا سے اٹھی اور مٹ گئی | زندگی ہے موجۂ آبِ رواں
فصلِ گل آئی، نشیمن جل گئے | ہائے دیوانوں کی دور اندیشیاں

تیری ٹھوکر ہے مدارِ زندگی
تیرے ٹھکرائے ہوئے جائیں کہاں ۱۹۲۸ء

رقصاں ہے بادلوں میں میرا شراب خانہ | ساقی نے کیا سمجھ کر رکھ لی مے مغانہ
پیمانہ شکستہ، روحِ فگار و خستہ | میرا یہی دفینہ میرا یہی خزانہ
وہ دل کی دھڑکنوں میں کیوں چھپ کے آن بیٹھا | تاروں کو جس نے بخشا یہ رقصِ جاودانہ
ہاں ہاں اندھیری شب ہے، چاند آج ابھرا کب ہے | کر لیجیے کنارا، گھڑ لیجیے بہانہ

مجھ کو ندیم، ہمدم، بے خانماں نہ جانیں
سبزے کا میرا بستر، تاروں کا شامیانہ ۱۹۲۸ء

تیرے قدموں میں غرورِ شش جہات | بس یہی ہے دے کے میری کائنات
فرش و کرسی وجد میں آ جائیں گے | سن سکے کوئی تو کہہ دوں ایک بات

چاند تاروں میں تو تیرا نور ہے — کون بیٹھا ہے ورائے ممکنات
تیرے دامن کا اشارہ چاہیئے — ٹمٹماتی ہے مری شمعِ حیات
زخم ہوتے ہیں دنوں میں مندمل — اور صدیوں تک چلی جاتی ہے بات
پیروی کا فن مجھے آتا نہیں
میں کہوں گا اپنے دل کی واردات — ۱۹۳۹ء

چھٹی شراب، مگر تہمتِ شراب رہی — عذاب ٹل نہ سکا، لذتِ عذاب رہی
کچھ آج ہی نہیں تقدیر میری مست خرام — یہ ساری عمر یونہی خانماں خراب رہی
ترا قصور نہیں، یہ تو عین فطرت ہے — مجھے بھی شام و سحر خواہشِ نقاب رہی
کہیں یہ تیرا تبسم نہ ہو تجلی ریز — چمک یہ کس کی سرِ پردۂ سراب رہی
کسی کی اٹھتی جوانی تو ہو گئی آباد
ندیم اپنی جوانی اگر خراب رہی — ۱۹۳۹ء

کوئی آخر کہاں تک مسکرائے — وہ جی اُمڈا، وہ اشک آنکھوں میں آئے
نرالے شعبدے ہیں اس کے بس میں — اُدھر دیکھے، اِدھر بجلی گرائے
مجھے قدرت سہی اپنی زباں پر — مگر تیرے مقابل کون جائے
مری تنہائیوں پر ہنس رہا ہے — الٰہی چاند افق پر ڈوب جائے

تری اندازہ دانی کے سہارے
کھڑا ہوں تیرے در پر سر جھکائے
برافگندہ نقاب آیا ہے کوئی
ندیمؔ اب کیا کروں، دیکھا نہ جائے
۱۹۳۹ء

جب چرخ پہ تارے مجھے کرتے ہیں اشارے
جاگ اُٹھتے ہیں خاکسترِ ماضی میں شرارے
آنکھوں سے اِدھر اشک ٹپکتے ہیں ہمارے
گردوں پہ اُدھر ٹوٹتے جاتے ہیں ستارے
ساحل پہ نہ موجیں ہیں نہ طوفاں نہ تلاطم
کشتی تو لگا سکتا ہوں دریا کے کنارے
تھی اُن کی نگاہوں میں بہت دور کی منزل
منزل پہ پہنچتے ہی جو منزل سے سدھارے
جس طرح کسی معبدِ خاموش میں فانوس
یوں دل میں چمکتے ہیں تصور کے شرارے
قطرہ ہو سمندر بھی اگر تیری نظر میں
قطرے میں نظر آئیں سمندر کے نظارے
تاثیر کے اسرار مجھے تو نہیں معلوم
کیوں کانپ رہے ہیں ترے ہونٹوں کے کنارے
یوں دل سے ندیمؔ اُٹھتی ہے آواز شبوں کو
جیسے کوئی بھٹکا ہوا منزل کو پکارے
۱۹۳۹ء

بجا کہ تیرے تغافل کے شکوے کرتا ہوں
تیری قسم کہ ابھی دم ترا ہی بھرتا ہوں
کٹھن ہے اپنا گلا کاٹنا کسی کے لئے
میں تیری راہ میں ایسا بھی کر گذرتا ہوں
نہ جانے نام ترا کیوں زباں پہ آتا ہے
میں ڈوب ڈوب کے جب بار بار ابھرتا ہوں

سُنا ہے تو مری پرواز کا مخالف ہے
تری خوشی کے لئے اپنے پر کترتا ہوں

لرز رہے ہیں یہاں چند لرزہ خیز اسرار
میں اپنی روح کی گہرائیوں سے ڈرتا ہوں

۱۹۳۹ء

روشن ہیں میری شمعِ محبت سے باغ و راغ
ملتا نہیں ہے پھر بھی کہیں حسن کا سراغ

اے چارہ گر۔ فضول تسلّی نہ دے مجھے
مجھ سوختہ نصیب کو حاصل کہاں فراغ

جلتے ہیں اضطراب کے شعلوں میں رات دن
بے نام لذتوں کے جنوں میں دل و دماغ

بس اے بہار۔ تیری ضرورت نہیں رہی
بلبل نے کر دیا ہے نشیمن سپردِ زاغ

جانے ندیم کون ہے ظلمت میں نغمہ زن
'کیا تم نہ کے پھر بھڑک اُٹھتے نہیں چراغ!'

۱۹۳۹ء

گھبرا کے شبِ ہجر کی بے کیف سحر میں
تارے اُتر آئے ہیں مرے دیدۂ تر میں

وہ آڑ میں پردے کے، تری نیم نگاہی
ٹوٹے ہوئے اک تیر کا ٹکڑا ہے جگر میں

اب وقت کے قدموں میں تحیّر کی ہے زنجیر
میں تیری نظر میں ہوں جہاں میری نظر میں

اُس پھول سے چہرے سے جب اُٹھ جاتے ہیں پردے
کانٹے سے کھٹک جاتے ہیں دامانِ نظر میں

اللہ! مرے کفر سے تو قطع نظر کر
میں تیری جھلک دیکھتا ہوں نورِ بشر میں

۱۹۴۰ء

گو میری بے کسی کا کوئی رازداں نہیں
تم سے تو میری بے پروبالی نہاں نہیں

یہ کیا کہا؟ کہ دل میں ہے غلطاں جمالِ دوست
میں پوچھتا ہوں جلوۂ جاناں کہاں نہیں

کہتے ہیں تم بھی میری عیادت کو آئے تھے
سنتا ہوں آج سر پہ مرے آسماں نہیں

دکھ بھی مرا تمہاری رضا کا غلام ہے
جو اشک تم نے پونچھ لیا، رائگاں نہیں

کیسے کہوں فسانۂ بے چارگیٔ شوق
تم سے نہاں نہیں ہے جہاں پر عیاں نہیں

مرگ و حیات میرے جنوں کی ہیں کروٹیں
مدت سے امتیازِ زمان و مکاں نہیں

دن رات ہولناک حوادث کی چھیڑ چھاڑ
اِس زندگی سے موت کی نیندیں گراں نہیں

اب برق کو ندیم مری کیوں تلاش ہے
مدت سے شاخِ گل پہ مرا آشیاں نہیں
۱۹۴۰ء

رُخِ ملیح سے گیسو ہٹا دیئے تو نے
چراغ عقل و خرد کے بجھا دیئے تو نے

یہ میرے دل میں ترا عکس جھلملاتا ہے
کہ مئے میں تارے گھلا کر پلا دیئے تو نے

فریب دے کے زمانے کو ناخدائی کے
سمندروں میں سفینے بہا دیئے تو نے

ترے لبوں سے بھی اے کاش سُن سکوں اک روز
سکوت میں جو فسانے سنا دیئے تو نے

تری قسم، کہ سفینے مری امیدوں کے
ڈبو کے آج کنارے لگا دیئے تو نے
۱۹۴۰ء

میری نظر کو حوصلۂ امتحاں نہ تھا
دیکھا تو میں ہی میں تھا کسی کا نشاں نہ تھا

تیری طلب میں کون و مکاں کی حدوں سے دور
پہنچا ہوں اُس مقام پہ تُو بھی جہاں نہ تھا

وہ وہ گھڑی سمٹ کے لجائے، چلے گئے
اے اشکِ غم ترا تو کوئی رازداں نہ تھا

نظارۂ جمال کی تابانیاں نہ پوچھ
وہ پیکرِ حسیں بھی جہاں تھا، وہاں نہ تھا

میں ہی پروں پہ تنکے اٹھا کر بڑھا ادھر
بجلی کی زد میں ورنہ مرا آشیاں نہ تھا

میں بھی جلا ہوں طور کی لَو پر، مگر ندیمؔ
ہونٹوں پہ میرے غلغلۂ الاماں نہ تھا

۱۹۴۰ء

سرا ہوں گا ترے من من کے روٹھ جانے کو
کہ بجلیوں کی ضرورت ہے آشیانے کو

نقاب ڈال رکھے ہیں دلِ فسردہ پر
کوئی سمجھ نہ سکا میرے مسکرانے کو

یہ کہتے کہتے ستارے افق پہ ڈوب گئے
کہ اتنا طول نہ دے دکھ بھرے فسانے کو

ترے جہاں میں ٹھکانا کہیں نہیں ملتا
پروں پہ لے کے نہ اُڑ جاؤں آشیانے کو

مزاج پوچھ کے رگ رگ میں بجلیاں بھر دیں
وہ آئے تھے مرے دل کی لگی بجھانے کو

سنا ہے حسن وہاں بے نقاب رہتا ہے
چلا ہوں طور پہ تقدیر آزمانے کو

مجھے بھی رخصتِ تعمیرِ آشیاں دیجے
چلے ہیں آپ اگر بجلیاں گرانے کو

وہ مر تو جائے کہ مرنا ہے روح کی معراج
مگر ندیمؔ سے کچھ آس ہے زمانے کو

۱۹۴۰ء

میں تجھ کو دیکھنے کی تمنّا میں چُور تھا — تو میرے آس پاس خراماں ضرور تھا

ناگاہ برق میرے نشیمن پہ آ گری — میں سوچتا رہا کہ مرا کیا قصور تھا

یہ پچھلی رات خواب میں وہ مسکرائے تھے — یا میرے آنسوؤں کے ستاروں کا نور تھا

اے خلوتِ شعور میں سمٹے ہوئے حسیں — تو سرحدِ خیال سے کس درجہ دور تھا

لو بجھ گیا کسی کی تمنّا لیے ہوئے

وہ دل کہ جس پہ کون و مکاں کو غرور تھا — ۱۹۴۰ء

غبارِ رنگ جو آئینۂ بہار میں ہے — وہی خزاں کے گریبانِ تار تار میں ہے

وہ شوقِ دید نگاہِ امیدوار میں ہے — کہ جیسے شام ستاروں کے انتظار میں ہے

مجھے قبول ہیں غمہائے جاوداں اے دوست — مری خوشی بھی مگر تیرے اختیار میں ہے

وفا کی لذتِ بے کیف ہے جمودِ حیات — مری جفا طلبی تیرے انتظار میں ہے

نظامِ دہر تیرے اختیار میں ہے مگر

میں سوچتا ہوں کہ تو کس کے اختیار میں ہے — ۱۹۴۰ء

اعجاز ہے یہ تیری پریشاں نظری کا — الزام نہ دھر عشق پہ شوریدہ سری کا

یہ سوچ میں کھوئی ہوئی افسردہ جوانی — شاید ہے نیا رنگ تری جلوہ گری کا

اس وقت مرے کلبۂ غم میں ترا آنا — بھٹکا ہوا جھونکا ہے نسیمِ سحری کا

تجھ سے ترے کوچے کا پتہ پوچھ رہا ہوں　　اس وقت یہ عالم ہے مری بے خبری کا

یہ فرش، ترے رقص سے جو گونج رہا ہے　　ہے عرشِ معلیٰ مری عالی نظری کا

کہرے میں تڑپتے ہوئے اے صبح کے تارے

احسان ہے شاعر پہ تری چارہ گری کا　　۱۹۴۱ء

اس قلبِ بیقرار میں، جانے، چھپا ہے کیا!　　میں جانتا نہیں ہوں مرا مدعا ہے کیا!

جس نے مری امید کی دنیا اُجاڑ دی　　سرگرمِ ناز پھر وہی طوفاں ہوا ہے کیا!

تجھ کو اگر سزا سے غرض ہے، سزا ہی دے　　کس منہ سے میں بتاؤں، کہ میری خطا ہے کیا!

ہنگامہ مچ رہا ہے خیالوں کی بزم میں　　تو نے دبی زبان میں جانے کہا ہے کیا!

احساس کی تپش سے یہیں جل مرا ندیم

اللہ! اس جہاں سے ابھی ماورا ہے کیا!　　۱۹۴۱ء

پھر حسینوں پہ اعتبار کریں　　آؤ پھر دل کو لالہ زار کریں

یہ دھرا ہے گناہوں کا انبار　　رحمتیں آپ ہی شمار کریں

آپ سے کچھ نہیں گلہ ہمکو　　یعنی کس کس سے آپ پیار کریں

راز ہی راز ہیں زمانے میں　　کونسا راز آشکار کریں

ہر طرف چھا رہی ہے تاریکی　　آؤ مل جل کے ذکرِ یار کریں

جسم بھی اُن کا جان بھی اُن کی   ہائے کیا چیز ہم نثار کریں

ابھر آئیں گے خود بخود مینار

پہلے بنیاد استوار کریں   ۱۹۶۱ء

تو گرفتار سہی، خوگرِ آزار ہیں ہم   ساغرِ گردشِ ایام سے سرشار ہیں ہم

ہم ترے شوق میں پروازِ جہاں کرتے ہیں   اور وہ پرواز، کہ بیگانۂ رفتار ہیں ہم

تو نے جس روز کیا وعدۂ پرسش ہم سے   بس اُسی روز سے آشفتہ و بیمار ہیں ہم

ہم سزا کے ہیں طلبگار، سزا دے ہم کو   ہم خطاکار ہیں، واللہ خطاکار ہیں ہم

آگ لگ جائے نہ احساس کے خرمن میں ندیم

اُس کی محفل میں پھر آمادۂ گفتار ہیں ہم   ۱۹۶۱ء

دل نے صدمے بہت اٹھائے ہیں   آپ لیکن ابھی پرائے ہیں

چھلنی چھلنی ہوئے ہیں جسم و جاں   تیر کیوں بے نشاں لگائے ہیں

آپ کیوں سامنے نہیں آتے   آپ کیوں روح میں سمائے ہیں

مختصر یہ ہے داستانِ حیات   پھول ڈھونڈے ہیں خار پائے ہیں

میں سمجھتا ہوں برق چمکی ہے   لوگ کہتے ہیں آپ آئے ہیں

آپ رستہ نہ بھول جائیں کہیں   آنسوؤں کے دیئے جلائے ہیں

ہچکیاں لے رہا ہے سازِ حیات — آپ کس دھن میں گنگنائے ہیں

کہکشاں ہے غبارِ راہ ندیمؔ

کس نے یہ راستے سجھائے ہیں — ۱۹۴۱ء

خلاصہ یہ ہے مرے دکھ بھرے فسانے کا — کہ میں رہا نہ قفس کا، نہ آشیانے کا

خزاں نصیب مقدر کا دل نہ دکھ جائے — چمن میں شور ہے فصلِ بہار آنے کا

بجا کہ بیت گیا دورِ گریۂ پیہم — مگر دماغ کہاں مجھ کو مسکرانے کا

کچھ اس طرح ترا طوفانِ ناز اٹھا ہے — نشان بھی نہ رہا میرے آشیانے کا

مجھے فسانے کا آغاز کر کے رونے دو — کہ اصل میں یہی انجام ہے فسانے کا

خدا تو سنتا ہے لیکن خدا سے مانگے کون — کہ حوصلہ نہ رہا قسمت آزمانے کا

ندیمؔ نزع کے عالم میں سوچتا ہی رہا

یہی تو وقت تھا دستِ دعا اٹھانے کا — ۱۹۴۱ء

دیا سا مرے قلب میں ٹمٹمایا — ذرا دیکھنا یہ حسیں کون آیا

خدا حافظ امید کی شاہزادی — افق پر وہ نجمِ سحر تھرتھرایا

بھلے ہیں کئی میٹھی نیندوں کے بدلے — یہ سنسان ٹیلے یہ تاروں کا سایا

امیدوں کی اے کرچیاں چننے والے — چٹانوں پہ کیوں آبگینہ گرایا

بایں ہوشیاری، بایں نازِ تمکیں
ندیمؔ اُن کی محفل میں دل بھول آیا ۱۹۴۱ء

گلشنِ شوق کا وہ سروِ خراماں نہ رہا
درد کافور ہوا جب کوئی درماں نہ رہا

ذرّے ذرّے میں ترا عکس نظر آتا ہے
راستہ دیکھتے رہنا بھی اب آساں نہ رہا

راتیں روتی ہیں کہ وہ چاند نہ ابھرا ابتک
دن بلکتے ہیں کہ وہ مہرِ درخشاں نہ رہا

سیلِ انوار میں وہ ڈوب گیا نجمِ سحر
میری سوئی ہوئی قسمت کا نگہباں نہ رہا

پردۂ ارض و سما کا یہ تکلّف کیسا!
ان حجابوں میں تو جلوہ ترا پنہاں نہ رہا

تجھ سے اک آس لگائی تھی پر اے جانِ ندیمؔ
یہ دیا بھی مرے سینے میں فروزاں نہ رہا ۱۹۴۱ء

مچلتی ہے مرے آغوش میں خوشبوئے یار ابتک
مری آنکھوں میں ہے اُس سحرِ رنگیں کا خمار ابتک

زمانہ ہو چکا اس اوّلیں مڈبھیڑ کو لیکن
سنائی دے رہی ہے تیری نظروں کی پکار ابتک

غمِ دوراں کی تاریکی کے سیلِ بے کنار اُمڈے
مگر ٹوٹا نہیں تیری تجلّی کا حصار اب تک

شبستانوں کے در ہر چند مجھ پر وا نہیں ہوتے
مگر اک مست و بیخود رات کا ہے انتظار ابتک

کوئی آتا نہیں اب دل کی بستی میں مگر پھر بھی
امیدوں کے چراغوں سے ہیں روشن رہگذار ابتک

ابھی تک نصفِ شب کو چاندنی گاتی ہے جھرنوں میں
نہیں بدلی شبابِ منتظر کی یادگار اب تک

جلا رکھے ہیں شہرا ہوں پہ اشکوں کے دیئے کب سے
نہیں گذرا مگر اس سمت سے وہ شہسوار اب تک

جو حسن و عشق کی پیکار میں آنکھوں سے ٹپکے تھے
انہیں تاروں سے ہے دامانِ ہستی زرنگار اب تک

شکستِ آرزو کو عشق کا انجام کیوں سمجھوں؟
مقابل ہے مرے آئینۂ لیل و نہار اب تک

ندیم ان مشعلوں کی جگمگاہٹ بڑھتی جاتی ہے
کہ لہرایا نہیں اس بزم میں دامانِ یار اب تک

۱۹۴۱ء

یہ تو فریادِ شکستِ ساز تھی
میں یہ سمجھا، آپ کی آواز تھی

پردہ در پردہ، نقاب اندر نقاب
زندگی کتنا رسیلا ساز تھی

میں کہاں، اسرار کا عرفاں کہاں
خود پریشانی تری غمّاز تھی

اپنی یکتائی کی کھاتا ہوں قسم
ہر گلی تیرا حریمِ ناز تھی

یہ کلی چٹکی گلستاں میں ندیم
یا مرے احساس کی آواز تھی

۱۹۴۲ء

جاتے کہاں تھے اور چلے تھے کہاں سے ہم
بیدار ہو گئے کسی خوابِ گراں سے ہم

اے نوبہارِ ناز، تری نکہتوں کی خیر
دامن جھٹک کے نکلے ترے گلستاں سے ہم

پندارِ عاشقی کی امانت ہے آہِ سرد
یہ تیر آج چھوڑ رہے ہیں کماں سے ہم

جس کے اثر سے وسعتِ عالم تھی یک نفس
لائیں گے وہ گدازِ طلب اب کہاں سے ہم

آؤ غبارِ راہ میں ڈھونڈیں شمیمِ ناز
آؤ خبر بہار کی پوچھیں خزاں سے ہم

تکلیفِ التفات نہ دیں گے شباب کو
ہیں بہرہ مند لطفِ غمِ جاوداں سے ہم

آخر دعا کریں بھی، تو کس مدعا کے ساتھ
کیسے زمیں کی بات کہیں آسماں سے ہم

اب جی میں ہے کہ کعبۂ مقصود کے عوض
مانگیں ترے نقوشِ قدم کہکشاں سے ہم

یہ خانۂ تباہ - یہ سلطانِ کجکلاہ!
پوچھیں گے آج اپنا پتہ میہماں سے ہم

۱۹۴۲ء

باغ اجڑے، باغبانی کیا کروں
اے محبت، اے جوانی کیا کروں

ہاتھ کیوں آنے لگا دامانِ یار
اشک کی دریا فشانی کیا کروں

جم گئی ہے گرد سی جذبات پر
زلف کی عنبر فشانی کیا کروں

دل کی لو سے اب دھواں اٹھنے لگا
یہ چراغِ لامکانی کیا کروں

زندگی اک رازِ بے بنیاد ہے
زندگی کی ترجمانی کیا کروں

عمر بھر رونا ہے جب اے آسماں
دو گھڑی کی شادمانی کیا کروں

موت جب آئے گی دیکھا جائے گا
زندگانی زندگانی کیا کروں

۱۹۴۲ء

گدائے راہ کہاں، قصرِ پادشاہ کہاں
مجھے اچھال گئی آہِ صبحگاہ کہاں

مری جبیں کو میسّر کہاں وہ سجدۂ شوق — مرے نصیب میں اب اُن کی بارگاہ کہاں
لبوں پہ پردہ کشائی کا ذکر کیوں آیا — جمالِ یار کے قابل مری نگاہ کہاں
ابھی ملیں، کہ کبھی، وہ مجھے ملیں تو سہی — مرے نیاز کی دنیا میں سال و ماہ کہاں
یہاں ممات کا کھٹکا، وہاں حیات کی قید — جہاں پناہ، ملے گی مجھے پناہ کہاں
کوئی تو اُن کو سنا دے مرا فسانۂ غم — مگر کسی کی ستاروں سے رسم و راہ کہاں

ندیم اور تماشائے حسنِ بے پروا!
گلیم پوش کہاں، صاحبِ کلاہ کہاں

۱۹۴۲ء

پھر موڑ پہ کعبے کے، صنم خانہ بنے گا — بتلایئے اب کون نہ دیوانہ بنے گا
کس کاکلِ مشکیں سے معطّر ہیں مرے دوش — کہہ دوں، مگر اس بات کا افسانہ بنے گا
پو پھوٹے گی، اور چھلکے گی مے نورِ شفق سے — چٹکے گی کلی اور مرا پیمانہ بنے گا
کیا رنگ نہ لائے گی مری سجدہ فروشی — ہر نقشِ قدم پر ترے بت خانہ بنے گا

رہنے دے ابھی طاق پہ شمعیں، کہ کسی روز
خاکسترِ پروانہ سے پروانہ بنے گا،

۱۹۴۲ء

مری نگاہ کا مقصود روئے یار نہیں — فدائے جلوہ ہوں، دیوانۂ بہار نہیں
میں تیرے خوابِ جوانی کی تابشوں پہ نثار — کوئی چراغ سرِ راہِ انتظار نہیں

یہ التفات نہیں، انقلاب ہے دل کا — یہ میرا ذوقِ نظر ہے، جمالِ یار نہیں

ترا بہار کا وعدہ درست ہے لیکن — مجھے بہار کے رنگوں پہ اعتبار نہیں

نہ کر تلاش مجھے، دل نہ ٹوٹ جائے ترا — کہ ایک شمع بھی روشن سرِ مزار نہیں

مری فسردہ نصیبی سے کھیلنے والے
ندیمِ خاک نشیں آزمودہ کار نہیں

۱۹۴۲ء

یہ باتیں عہدِ جوانی کی میں نے کس سے کہیں — مرے قریب وہ بیٹھے ہوئے بھی ہیں کہ نہیں

ترے کرم کا سہارا تو تھا امیدوں کو — مگر یہ چڑیاں شکستہ پروں سے اُڑ نہ سکیں

نہیں، تو خاک میں یہ قوت و حیات ہے کیا — وہ اس جہان میں پوشیدہ ہیں کہیں نہ کہیں

وہ تیرتے ہیں خلاؤں میں مضطرب سائے — مکاں کی قید سے آخر نکل چلے ہیں مکیں

مرا نیازِ فلک گیر ہو چلا کب کا — ترے جمال کی پہلی لطافتیں نہ رہیں

میں اُڑ رہا ہوں اب اک بیکراں دھندلکے میں — مری اڑان کی منزل نہ آسماں نہ زمیں

وہ ایک تنگ سے کوچے میں سرسری مڈبھیڑ — بس اتنی بات ہے، پھر کیا ہوا تھا! یاد نہیں!

ندیم۔ میری پریشاں خیالیوں پہ نہ جا
ترے ندیم کا سایا ہوں میں، ندیم نہیں

۱۹۴۲ء

مجھے اگرچہ ترے حسن میں کلام نہیں — مگر یہ خواب ہے اور خواب کو دوام نہیں

بھلا یہ کونسی منزل ہے بے نیازی کی — کہ آجکل مرے ہونٹوں پہ تیرا نام نہیں
نہ چلمنوں کی نقابیں، نہ خلوتوں کے سرور — تری بہشت سے ہم دل جلوں کو کام نہیں
چمن میں کس نے گرہ کھول دی مرے دل کی — اگر کلی کی چٹک میں ترا پیام نہیں
قدم قدم پہ نیا رنگ ہے زمانے کا — یہ گردشیں ہیں فلک کی، ترا خرام نہیں
ندیمؔ خاک کا ذرّہ ہے کائنات بدوش
مری نگاہ میں اب جلوۂ ہائے بام نہیں — ۱۹۴۲ء

دریچۂ مہ و انجم میں جگمگاؤ نہیں — کسی کی تیرہ نصیبی کو آزماؤ نہیں
مجھے خبر ہے، مرا عشق ہے زبوں انجام — وہ راز، جو مجھے معلوم ہے، بتاؤ نہیں
براہِ راست گراؤ اسے لبوں پہ مرے — شراب ساغرِ بلّور میں پلاؤ نہیں
یہ دھیمی دھیمی سی لرزش ہے راز کی غمّاز — تہِ نقاب جبیں مجھ پہ مسکراؤ نہیں
نہ ڈالو عکسِ رُخِ ناز میری آنکھوں پر — بجھے چراغ ہی اچھے، انہیں جلاؤ نہیں
ابھی نہیں اُسے اپنے کرم کا اندازہ
ندیمؔ دستِ طلب کو ابھی بڑھاؤ نہیں — ۱۹۴۲ء

مری نگاہ سے یہ پردہ کس نے سرکایا — جبینِ شوق کو سجدوں کا پھر خیال آیا
یہی، لٹی ہوئی نیندیں، یہی فسردہ دلی — میں سوچتا ہوں کہ سب کچھ لٹا کے کیا پایا

یہاں نہ ساز کی جھنکار ہے، نہ رقص کی دُھن
خیال نے مجھے کس انجمن میں پہنچایا

یہ تیری بزم ہے یا پتلیوں کا ناٹک ہے
ابھی تو لا کے بٹھایا، ابھی نکلوایا

خفا کا اب نہ بہانہ تراش، میں خوش ہوں
کہ دل کا آخری قطرہ بھی تیرے کام آیا

خدا کو مدِّ نظر تھی جمال کی تخلیق
تو اک فرشتہ ہیولیٰ ترا اُٹھا لایا

ترے جہاں میں ہے کیوں پختگی فنا کی دلیل
کہ غنچہ ہنستا رہا، اور پھول مرجھایا

مجھے بھی دیکھ ستاروں کو ڈھانپنے والے
بجھا کے اپنا دیا تیرا نام چمکایا

۱۹۴۲ء

انگڑائی کی اوٹ میں جانے، پوشیدہ ہیں کتنے بہانے
مفت میں اُٹھے ہو دنیا کو اوجِ ثریا سے ٹکرانے

تیری قدرت کھیل رہی ہے، یا میری کوتاہ نگاہی
جنّت کی بنیاد رکھی تھی، پر تیار ہوئے غم خانے

حُسن کی بزمِ ناز میں کیسے سنجیدہ بن کر بیٹھے تھے
عشق نے ایسا نالہ کھینچا بھاگ اُٹھے اپنے بیگانے

عدل کا دعویٰ کرنے والا مجھ پہ کیا الزام دھرے گا
اس نے میرا سچ بھی ٹوکا، میں نے اُس کے جھوٹ بھی مانے

دور بھی کر پُرہول اندھیرے، روک بھی لے سیلابِ تباہی
ورنہ تھک کر چل نکلوں گا طوفانوں میں دیئے جلانے

تیرا پتہ تو خیر نہ پایا، اب گھر کا رستہ تو دکھا دے
ٹامک ٹوئیے مار کے آخر بھول گیا ہوں ٹھور ٹھکانے

سورج کے زرتار کلس پر اونگھ گیا قسمت کا پنچھی
آؤ چلیں سب خفتہ مقدر چرخ کا نیلا گنبد ڈھانے

کانٹوں سے بچنے کی خاطر ہم نے اتنا وقت گنوایا
وہ ندی کس شان سے لپکی، کہساروں میں راہ بنانے

عشق کا یہ انداز نہ بھایا، بجھے دیئے پر کوئی نہ آیا
لو کانپی تو چار طرف سے ٹوٹ پڑے لاکھوں پروانے

آج سراپا گوش ہے عالم، کہہ دے جو کچھ کہنا چاہے
پھر طوفانِ سنگ کی زد میں آ نہ سکیں گے آئینہ خانے

آخر اس گھمسان کے رن میں روح کہاں تک جم کر لڑتی
حسن آیا آنکھوں کو رجھانے، عشق چلا دل کو بہکانے

عمر کے ساتھی سے یہ دھڑکا، چلمن سرکی، شعلہ بھڑکا
آنکھوں نے تو بہت کچھ دیکھا، دل کیا جانے، دل کیوں مانے

گلیوں کے موڑوں پہ ٹھٹکنا، رکنے کی کوشش میں لپکنا
پہروں تکنا اور نہ تھکنا، ہائے وہ نادانی کے زمانے

راتوں کے سونے محلوں میں تانیں کون اڑا جاتا ہے
شاید اس تاریک خلا میں لرزاں ہیں ماضی کے ترانے

تیر چلانا کام ہے تیرا، قید ہدف کیا، تیر چلا دے
جسم بھی چھلنی، روح بھی چھلنی، اور کہاں سے لاؤں نشانے

پھر احساس کے دوراہے پر وہ حیران ندیم کھڑا ہے
پورب تیرا، پچھم تیرا، یہ بدبخت کہاں کی ٹھانے

۱۹۴۲ء

چلی تو ہے چمنستانِ جاں میں بادِ مراد
مگر چراغِ خرد کی تجلیاں ہیں زیاد

نہ پا سکیں گے کبھی ناقۂ حبیب کی گرد
غبارِ راہ سے جو کارواں رہے آزاد

ابھی تو صرف ستاروں پہ ہے نگاہ تری
کئی جہان دکھائے گی لذتِ ایجاد

نہ جانے اوجِ تخیل کی انتہا کیا ہے
بلندیوں پہ کوئی شاذ ہی رہا ہے شاد

ستیزہ کار رہے، اور سنبھل سکے نہ کبھی
جمالِ پاک نہاد و خیالِ خاک نژاد

ادھر شرارہ مزاجی، ادھر سکوں طلبی
نہ مٹ سکے گا کبھی خواہش و خرد کا عناد

ترے مذاق کے صدقے، بکھیر دیں تو نے
قدم قدم پہ کئی قمریاں، کئی شمشاد

نقوش پھیلتے جاتے ہیں خونِ دہقاں کے
کہاں ہیں میرے زمانے کے مانی و بہزاد!

۱۹۴۳ء

نقش مٹتی ہوئی کونوں کا ابھارا کس نے؟ — بامِ انجم سے کیا مجھ کو اشارا کس نے؟

جانے بھٹکے ہوئے راہی پہ کسے رحم آیا — رات کے اونگھتے سایوں میں پکارا کس نے؟

تیری بھیگی ہوئی پلکوں پہ محبت کے سوا — ٹمٹماتے ہوئے تاروں کو اتارا کس نے؟

کشتیِ زیست کنارے پہ لگی ہے شاید — عینِ طوفاں میں دیا ورنہ سہارا کس نے؟

کلیاں روتی ہیں کہ بھونروں نے انہیں کیوں تاکا — بھونرے حیراں ہیں کلیوں کو نکھارا کس نے؟

یہ دھنک ہے تو عناصر کے فریبوں پہ نثار
ورنہ تھاما ترے آنچل کا کنارا کس نے؟ ۱۹۴۳ء

نہ شعور میں جوانی، نہ خیال میں روانی — کوئی سن کے کیا کرے گا مری دکھ بھری کہانی

نہ زوالِ ناگہانی، نہ عروجِ جاودانی — مری زندگی کا عنواں، فقط ایک لفظ ’فانی‘

مرے کفر کی ہے ضامن یہ خرد فریب دوری — مری تیرگی زمینی - ترا نور آسمانی

یہ شکست کا جہنم کہیں پھر بھڑک نہ اٹھے — مرے عشق کے کھنڈر پر، نہ کریں وہ گل فشانی

تری زندگی حقیقت - مری زندگی فسانہ — وہ خرد کی تنگ طرفی - یہ جنوں کی بے کرانی

نہ گمانِ یار ان پر، نہ جمالِ یار ان میں — ترے کوکب و قمر سے نہ بہل سکی جوانی

رہے دل کا داغ دائم کہ جھلک رہی ہے اس میں — ترے مہر کی تمنا، ترے قہر کی نشانی

نہ سمجھ سکی مشیت، نہ بدل سکا زمانہ — وہی تیغِ اصفہانی، وہی خونِ ارغوانی

مجھے اور زندگی دے، کہ ہے داستاں ادھوری
میری موت سے نہ ہوگی مرے غم کی ترجمانی ۱۹۴۳ء

ٹوٹتی راتوں کی خاموشی میں رونا چھوڑ دے
ان ستاروں کو جلی مٹی میں بونا چھوڑ دے

یہ تری طفلانہ تعمیریں شکست انجام ہیں
اوس کے قطروں کو کرنوں میں پرونا چھوڑ دے

جب الجھنا ہے تجھے کانٹوں سے تپتی دھوپ میں
سرد تہ خانے میں پھولوں کا بچھونا چھوڑ دے

اس کے دامن میں اگر شب ہے، ستارے بھی تو ہیں
گردشِ افلاک سے مایوس ہونا چھوڑ دے

تو اگر اب تک جمالِ یار کا قائل نہیں
صبح کی سرشار تنویروں میں سونا چھوڑ دے

۱۹۴۳ء

خروشِ آگہی سے روح وقفِ پیچ و تاب ہے
حباب پر ابھی گمان پر تو حباب ہے

فرازِ طور سے اُتر، نشیبِ زندگی میں آ
کہ حکمتِ جدید میں ترا وجود خواب ہے

نقاب کا خیال ہی نقاب بن گیا نہ ہو
یہ روئے ناز ہے کہ میری آنکھ ہی پُر آب ہے

وہی جمالِ مشتعل، وہی نگاہِ مضمحل
اگر یہ خواب ہے تو کس کو آرزوئے خواب ہے

تصورِ حبیب ہے ندیمِ جانِ میکدہ
نظر نظر شراب ہے، نفس نفس رباب ہے

۱۹۴۳ء

کروٹیں وقت کی بیکار ہوئی جاتی ہیں
اور بھی درپئے آزار ہوئی جاتی ہیں

خواہشیں مائلِ اظہار ہوئی جاتی ہیں
یعنی ناقابلِ گفتار ہوئی جاتی ہیں

گتھیاں ولولۂ شوق کی سلجھیں کیونکر
جتنی کھلتی ہیں، پراسرار ہوئی جاتی ہیں

ہر تقاضے پہ نیا ضابطہ رہتا ہے سوار — روحیں لفظوں میں گرفتار ہوئی جاتی ہیں
شاید اب ابر کے چھٹنے کا گماں باطل ہے — صبحیں ہم رنگِ شبِ تار ہوئی جاتی ہیں

اتنی بوجھل ہے شبستانِ محبت کی ہوا
میری سانسیں بھی مجھے بار ہوئی جاتی ہیں — ۱۹۴۳ء

خوابوں کی بستیاں نہ بسائیں، تو کیا کریں — ہمت شکن ہوں ان کی حیائیں، تو کیا کریں
رحمت طلب ہے اپنی تہی دامنی، مگر — موتی لٹائیں اودی گھٹائیں تو کیا کریں
یہ حشرِ انتظار ہے، وہ انتظارِ حشر — جائیں تو کیا کریں، جو نہ جائیں تو کیا کریں
آنکھوں کے پھوٹنے سے ہمیں کیا ملا، مگر — حد سے بڑھیں کسی کی عطائیں، تو کیا کریں
آئینے کی تلاش میں ہے حُسنِ خود پسند — گردوں سے آفتاب نہ لائیں، تو کیا کریں
تعمیل کو گناہ سمجھتے ہیں محتسب — کچھ کہہ رہی ہوں تنگ قبائیں تو کیا کریں

جب گردشِ سپہرِ کہن رک چکی، ندیمؔ
اک تازہ آسماں نہ بنائیں، تو کیا کریں — ۱۹۴۳ء

چاندنی پر گماں سیاہی کا — شعبدہ تیری کم نگاہی کا
زشت اور خوب کے شعور میں ہے — راز — انسان کی تباہی کا
بندے کی خواہشِ خداوندی — زیرِ دریا، خرام ماہی کا

صبح کے سیلِ رنگ و نور سے پوچھ — مدّعا رات کی سیاہی کا
راستہ دیکھتا ہے تیرا حریم — جانے کس بے نیاز راہی کا
مردنی چھا گئی اوامر پر — ذکر جب چھڑ گیا نواہی کا
پاسبانوں کو جبر کی تاکید — اور دعویٰ جہاں پناہی کا!
اے مرے عشق میری تنہا بھول — وقت آیا تری گواہی کا

ڈوبتا چاند ہے جواب ندیم
میری فریادِ صبحگاہی کا — ۱۹۴۴ء

مہ و ستارہ و خورشید و ذہنِ انسانی — کہاں کہاں نہ اٹھے ممکنات کے شعلے
نمودِ صبح نہیں ہے، چتا سلگتی ہے — مچل رہے ہیں خلاؤں میں رات کے شعلے
کہیں دھواں ہے کہیں رقص ہے تجلّی کا — یہ کائنات ہے یا کائنات کے شعلے
جلا جلا کے مجھے کیمیا بنا کے رہے — ہزیمتوں کے شرر، مشکلات کے شعلے
یہ راز کیا ہے کہ تخلیقِ نوعِ انساں پر — سنبھل سکے نہ شبستانِ ذات کے شعلے

حکیم سوختہ ساماں، ندیم برقِ طپاں
الٰہی! روک ہی لے التفات کے شعلے — ۱۹۴۴ء

تری جوانی کے پاسباں حشر تک یونہی نوجواں رہیں گے
ترے گلستانِ رنگ و بو میں نسیم بن کر رواں رہیں گے

قبول ہے تیری کبریائی، مگر کبھی یہ بھی تو نے سوچا
یہاں بھی تو ہے وہاں بھی تو ہے غریب انساں کہاں رہیں گے

میں ظلمتوں سے الجھ الجھ کر وہ دور نزدیک لا رہا ہوں
مسافروں کی تلاش میں جب نجوم کے کارواں رہیں گے

مری بغاوت کا آخری آسرا ہے روزِ حساب تیرا
بہت بڑے معرکے رہیں گے بہت کڑے امتحاں رہیں گے

یہ تیرے بندے ہیں یا مقدر کے ہاتھ میں کانچ کے کھلونے
فنا سے ڈرتے رہیں گے لیکن حیات سے سرگراں رہیں گے

جکڑتی جائیں گی ان کے ذہنوں کو گردشِ نو بنو کی کڑیاں
اگر ترے آسمان انسان پہ یونہی مہرباں رہیں گے

مزاجِ فطرت پہ ابنِ آدم کی ہر مسرت گراں رہی ہے
بہار آئے گی، اور ہم محوِ انتظارِ خزاں رہیں گے

وہ ٹوٹتی رات کی خموشی، وہ تیری آنکھوں کی مے فروشی
ہم اُس دھڑکتی ہوئی حکایت کے عمر بھر رازداں رہیں گے

جلال وجمال

چھپا نہ تا خیر کی حقیقت کہ چھوٹی انگڑائیوں کے پیچھے
یہ گال بھی گلفشاں رہیں گے، یہ ہونٹ بھی ارغواں رہیں گے
نقاب اُٹھتے رہیں گے، بُنتے رہیں گے رازوں کے تانے بانے
ندیم یہ مصلحت ہے ان کی، وہ حشر تک بے نشاں رہیں گے
۱۹۴۴ء

امنگ مجھ کو نہیں چرخِ نو بنانے کی
ابھی ہوس ہے ستاروں کی تھاہ پانے کی

یہ روز روز کا جھگڑا چکے، تو چین آئے
رکھوں گا برق پہ بنیاد آشیانے کی

جہاں پناہ! مجھے بازوؤں میں لے لیجے
مری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی

مجھے تو ضبط کی راتیں قبول تھیں، لیکن
ستارے بن کے رہیں سرخیاں فسانے کی

نہ چھینیے مرے غموں پر تسلیوں کے گلاب
مرے نصیب کو عادت ہے روٹھ جانے کی

نوازشوں نے طلب کا گداز چھین لیا
بس اب تو عام کرو رسم دل دکھانے کی

وہ میرے عشق کا مقصودِ خاص پوچھتے ہیں
ضرورت آن پڑی آئینہ دکھانے کی

کس انقلاب کی غماز ہیں، خدا جانے
ترے خرام میں اٹھکیلیاں زمانے کی

جمال، عرش کے فنکار کا ہے اوجِ کمال
سمندِ ناز کو کیا فکر تازیانے کی

ندیم کھیل رہا ہوں پرانی یادوں سے
یہی تو آخری کوشش ہے بھول جانے کی
۱۹۴۴ء

وہ کون ہے جو مرے گرجتے سکوت کا مدعا نہ سمجھا
مرے ارادوں کی چرخ گیری کو صرف میرا خدا نہ سمجھا

مرے تصور کی ظلمتوں میں نہ جھلملائیں بقا کی کرنیں
اگرچہ میں نے ابد کو اپنے خیال سے ماورا نہ سمجھا

مرے افق کی حدوں نے بڑھ کر سمیٹ لی کائنات ساری
یہ زندگی پارسائیاں تھیں، جنہیں کوئی پارسا نہ سمجھا

میں تیرے بندوں کی پادشاہی سے کچھ تو مانوس ہو چلا تھا
مگر یہ دل یعنی میرے احساس کا یہ فرمانروا نہ سمجھا

اکھڑ چلی ہے اساسِ عالم، تو اس میں میرا قصور کیا ہے
جنونِ معجز نما نہ مانا، جمالِ محشر ادا نہ سمجھا

بس اب ذرا احتیاط سے حکمِ بندگی دے کہ مدتوں تک
کسی نے میری تڑپ نہ دیکھی، کوئی مری التجا نہ سمجھا

اگرچہ پائیں قدم قدم پر سرور و مستی کی بارگاہیں
تلاش کے کیف نے مگر انتہا کو بھی انتہا نہ سمجھا

کہیں بڑھاپے کی خوش خرامی، کہیں جوانی کی نرم گامی
ندیم سا بندۂ رضا بھی ترا طریقِ عطا نہ سمجھا

۱۹۴۴ء

چمن کے بھیس میں بکھرے ہوئے ہیں ویرانے
مرے خدا کی حقیقت مرا خدا جانے

میں خود شناس سہی، خوش مذاق ہے صیّاد
سیاہ دام میں تاروں کے نقرئی دانے

بچھا دے ان کو مری بیقرار باہوں پر
کہ بارِ زلف سے تھک جائیں گے ترے شانے

عجیب شمع ہے جو جل کے خود نہیں بجھتی
عجیب تر ہیں مگر بے نیاز پروانے

دلوں میں بس کے فریبِ تلاش دیتا ہے
اگرچہ تو نہ ملا، تیرے راز پہچانے

رُخِ ملیح، لبِ سُرخ، زلفِ ژولیدہ
بہت لطیف ہیں رسوائیوں کے افسانے

ندیم سنگ کو صیقل کیا حوادث نے
بہت قریب سے دیکھے ہیں آئینہ خانے

۱۹۴۵ء

بیانِ شوق کو مرہونِ خامشی تو کروں
ترے سکوت کی لیکن برابری تو کروں

میں چھوڑ دوں ترے کہنے سے احترامِ جفا
مگر میں ذوقِ وفا میں ذرا کمی تو کروں

یقیں تو ہے مجھے پیمانِ دوست پر، لیکن
میں اپنے آپ کو مجبورِ زندگی تو کروں

مجھے غروب کا پیغام ہے قبول، مگر
میں تیرے چاند ستاروں کی ہمسری تو کروں

مجھے بہشت سے انکار کی مجال کہاں
مگر زمیں پہ محسوس یہ کمی تو کروں

نقاب الٹ کے نہ آرزوؤں کو عام نہ کر
میں اپنے ذوقِ تماشا کو مدعی تو کروں

بجا کہ تو نے نشیب و فراز دکھلائے
مگر حضور میں دعوائے آگہی تو کروں

اجل کے خوف سے آزاد ہے حیات مری
مگر یہ شوق — تماشائے جانکنی تو کروں

الٰہی حشر میں دے رخصتِ نمائشِ دل
میں اِس بسیط اندھیرے میں روشنی تو کروں

بس ایک پل کے لئے زیست کا حجاب اٹھا
عدم فروش قہقہوں سے دل لگی تو کروں

ندیم اوجِ محبت فراقِ یار سہی
مگر میں عشق کے عنوان کو جلی تو کروں

۱۹۴۵ء

تلاش کی جان ہے حقیقت میں حشر تک تشنہ کام ہونا
یہ التجا ہے کہ عینِ منزل پہ بھی نہ بالائے بام ہونا

تمہیں بتاؤ، یہ مصلحت تھی کہ ابنِ آدم کی بدنصیبی
مرا زمیں پر قیام ہونا، تمہارا گردوں مقام ہونا

تنی ہوئی منتظر قبائیں، کھلے رخ، کارگر ادائیں
تمہیں مرے ضبط کی قسم ہے کہ حشر میں یوں نہ عام ہونا

تمہارے دعوائے برتری کی بقا کا ضامن ہے در حقیقت
مری امنگوں کا نرم ہونا، مرے ارادوں کا خام ہونا

جانے کتنی قیامتوں کی امین یہ دو صداقتیں ہیں
جنوں کا طوفاں خرام ہونا شعور کا نرم گام ہونا

مجاز کی تلخ انتہا تھی، کہ مری حقیقت کی ابتدا تھی
کسی تصور سے پہلے پہلے ندیم کا ہم کلام ہونا

۱۹۴۶ء

ہا جائے گا چپ کیسے خدا کے روبرو ہم سے
نہ کر محشر میں تسلیم و رضا کی گفتگو ہم سے

ہمیں مدہوش رکھ سکتا ہے جب احساسِ سرشاری
تو کس پندار پہ چھینا ہے ساقی نے سبو ہم سے

ہماری خامیاں طوفان ہیں بحرِ مشیت میں
خدا شاہد، خدائی کی ہے قائم آبرو ہم سے

سکوتِ خام نے شب کی کہانی عام کی، ورنہ
بہت گھل مل کے باتیں کر رہا ہے کیوں عدو ہم سے

جسے تقریبِ آغازِ محبت پر نکھرنا تھا
نہ لایا جا سکا اب تک وہ نغمہ تا گلو ہم سے

لبوں نے پپڑیوں نے کھول رکھا ہے بھرم سارا
زمانہ کب سنے گا داستانِ جستجو ہم سے

سوا تیرے کئی آئینہ رو حیرت سے کہتے ہیں۔
ندیم اس عمر میں بیگانہ کیوں رہتا ہے تو ہم سے

۱۹۴۶ء

فروغِ ماہ میں تو اور شبِ سیاہ میں تو
بہر لباس نمایاں مری نگاہ میں تو

ترے غرور کے انداز سے ہویدا ہے
نہ مل سکے گا مجھے زندگی کی راہ میں تو

اب اس سے بڑھ کے ثبوتِ بقا نہیں ممکن
تری پناہ میں دنیا، مری پناہ میں تو

ترے لبوں کے کناروں پہ کپکپی کیسی!
کھڑا ہے جیسے محبت کی بارگاہ میں تو

درود کی ابدیت ہے قرب کی معراج
نہ کھل سکے گا ملاقات گاہ گاہ میں تو

چراغ تھکنے لگے، بھیگنے لگیں آنکھیں
کب آسکے گا مرے خانۂ تباہ میں تو

اس اجتناب کے صدقے کہوں گا حشر کے دن
کہ منعکس تھا مری خواہشِ گناہ میں تو

۱۹۴۶ء

یہ میری بے صبری ہے کہ تیری بے خبری
مرا جنوں عملی ہے، تری خرد نظری

اب آفتاب کی باری ہے رات بھاری ہے
میں دیکھتا ہوں کب تک ستارۂ سحری

یہ اہتمامِ علاج ایک سعیِ خام نہ ہو
کہ اب تو درد ہی کرتا ہے میری چارہ گری

یہ ایک قطرۂ شبنم ہے آفتاب بدست
بہت قریب سے دیکھی ہے فطرتِ بشری

جہاں سے پھول گرا تھا وہیں کلی چٹکی
اگر ہے ننگ یہی تو نثار فتنہ گری

زمیں اداس، ستارے اداس، چاند اداس
یہ پچھلی رات ہے یا تیری شانِ کم نظری

یہ تجھ کو دیکھ کے کیوں لوگ مجھ کو دیکھتے ہیں
یہ تیری جلوہ گری ہے کہ میری پردہ دری

فلک پہ ٹوٹے ستارا، زمیں پہ اشک گرے
مرے ندیم، یہی ہے کمالِ بخیہ گری

۱۹۴۶ء

یہ بھی شبِ تار، وہ بھی شبِ تار
جینا بھی دشوار، مرنا بھی دشوار

ہونٹوں کی لرزش کچھ کہہ رہی ہے
اک مدعا ہے محتاجِ اظہار

بنیاد جن کی خود آگہی ہو
وہ مستیاں ہیں مستوں کو درکار

سانسوں میں رم ہے آنکھوں میں دم ہے — کس نے بلایا دھارے کے اُس پار

اے ذوقِ پرواز اب ضبط کیسا! — اُٹھتی رہے گی زنداں کی دیوار

شاید ہی ٹوٹے یہ ربطِ باہم — بندہ گنہگار، آقا سبکسار

شہکارِ فطرت! اے وائے فطرت — ہر چیز معصوم، انسان عیار!

حکمِ مساوات اور امتیازات — تارے دل افروز، کلیاں دل افگار

انسان اب کچھ نکھرے تو نکھرے — سُونے پڑے ہیں شاہوں کے دربار

ہم تو ندیم اب اُکتا چلے ہیں
انوار ظلمات — تکرار، تکرار

۱۹۴۶ء

خدا نہیں، نہ سہی، ناخدا نہیں، نہ سہی — ترے بغیر کوئی آسرا نہیں، نہ سہی

تری طلب کا تقاضا ہے زندگی میری — ترے مقام کا کوئی پتا نہیں، نہ سہی

تجھے سنائی تو دی، یہ غرور کیا کم ہے — اگر قبول مری التجا نہیں، نہ سہی

مرے چمن میں تو برسوں کے بعد پھول کھلے — تری بہار گری برملا نہیں، نہ سہی

تری نگاہ میں ہوں، تیری بارگاہ میں ہوں — اگر مجھے کوئی پہچانتا نہیں، نہ سہی

میں ابتدائی سکھوں کے سہارے جی لوں گا — مرے دکھوں کی کوئی انتہا نہیں، نہ سہی

شبِ سیاہ کی تاریکیوں کا ساتھ تو ہے — کوئی ستارہ مرا رہنما نہیں، نہ سہی

نہیں ہیں سرد ابھی حوصلے اڑانوں کے — وہ میری ذات سے بھی ماورا نہیں، نہ سہی

وہی ندیم، وہی حسن کا قصیدہ نگار — ترے حضور اگر لب کشا نہیں، نہ سہی

۱۹۴۶ء

زلفِ سیاہ خم بہ خم، نورِ جمال یم بہ یم
رازِ حیات کی قسم، جلوۂ ذات کی قسم

مجھ کو فریب دے سکیں کیسے افق کی لرزشیں
جب کہ غروبِ مہر سے دور نہیں مرا حرم

تیرے سفر کا مدعا، تیری خرد سے ماورا
جم نہ سکے تری نظر، رک نہ سکے ترا قدم

تیرا رواج رہنما، میرا مزاج رہنما
میرا عدم بھی عینِ زیست، تیرا وجود بھی عدم

شوقِ سجود تیری دین، ذوقِ قعود میرا دین
تیرے گماں میں کیوں کروں اپنی حقیقتوں کو ضم

اُٹھنے لگے حجاب کیوں، چھٹنے لگے سحاب کیوں
لٹنے لگا ہے میرا غم، گھٹنے لگا ہے میرا دم

کیفِ وصال سے سوا، قربِ جمال سے سوا
میرے خیال سے ترا میرے خیال ہی میں رم

لہریں مرے جنوں کی ہیں، سرخیاں میرے خوں کی ہیں
چہرۂ شہریار پر میرا فسانہ ہے رقم

بوئے چمن کی بحث تھی، وہ جو نہیں تو کچھ نہیں
برگِ گلاب پر ابھی رنگ تو ہونگے مرتسم

۱۹۴۶ء

پلٹنا چاہو، تو جاؤ، ابھی اجالا ہے
مرا حریمِ طلب تو بعید و بالا ہے

خودی نے خلد سے انسان کو نکلوایا
خودی نے خلد کا پھر راستہ نکالا ہے

یہ میرے ذہن میں ہے عزمِ انقلاب رواں
کہ جھٹپٹے میں لپکتی ہوئی غزالہ ہے

میں دم بخود ہوں، پرستش کروں کہ عشق کروں
جمال حور کا انسانیت کا ہالا ہے

یہ پھول بھی تو اسی دھول سے اُگے ہیں ندیم
مرا خدا مری دنیا کا رہنے والا ہے

۱۹۴۷ء

متفرّق اشعار

صد نالۂ شبگیرے، صد صبح بلاخیزے
صد آہِ شرر ریزے، یک شعرِ دل آویزے

(پیامِ مشرق)

۱۹۳۶ء

پھر طور پر نگاہِ تماشا ہے مضطرب	حیرت ہے چھپ گیا ہے مرا شعلہ زن کہاں

•

دل نے جو رنج اٹھائے ہیں وہ تو کیا جانے	تشنہ کاموں پہ جو گذری، وہ سبو کیا جانے

•

اس قدر وجد، اس قدر مستی!	پہلا پہلا گناہ! کیا کہنے!

•

جہاں والے ہمیں صرف اس لئے دیوانہ کہتے ہیں
کہ ہم جو بات بھی کہتے ہیں، بے باکانہ کہتے ہیں

•

دوزخ کا حکم تیری مشیت سہی، مگر	اے ربِ کعبہ میرا افسانہ سنا بھی ہے

•

دام کے نیچے چٹک کر کہہ رہی ہے اک کلی	جو یہاں آئے گا وہ گلشن بداماں جائے گا

•

گردشِ چشمِ یار کے الزام
آسماں پر لگائے جاتے ہیں

۱۹۳۷ء

اگر تو خود نہ دے درویش کو بھیک
تری بندہ نوازی کا مزا کیا

•

مری خاموشیوں میں کروٹیں لیتے ہیں ہنگامے
زمانے پر قیامت بن کے ٹوٹے گا سکوں میرا

•

ہم خاک نشینوں میں، اس خاک نشینی پر
کیوں تیری مروّت کے چرچے ہیں، خدا جانے
زلفوں نے ندیم ایسا طوفان اٹھایا ہے
قسمت کو بھی شاید ہی یوں آتے ہوں بل کھانے

•

تو سامنے آجائے تو بجھ جائیں ستارے
تو دیکھے تو پھولوں کو بھی آجائے پسینہ

•

بہت مشکل ہے جینا تیرے وعدوں کے بھروسے پر
جگر کٹ کٹ گیا تب جا کے آخر وقتِ شام آیا

•

کس کی آمد ہے کہ منزل سے کئی کوس اُدھر
بہرِ پابوس مرا دیدۂ خونبار گیا

•

بل پڑے اس قدر نصیبوں میں
اُن کی زلفوں کے خم نہیں کچھ بھی

•

او جھرجھری لے کے اُٹھنے والے
تو سن نہ سکا مری کہانی

گناہوں کو میں کیوں گن گن کے روؤں　　تری رحمت اگر اندازہ داں ہے

•

سر بھی ایسا ہو جو سجدوں کی حقیقت سمجھے　　در بھی ایسا ہو جو شایانِ جبیں سائی ہو

•

عمر بھر رونے سے رونے کا سلیقہ کھو دیا　　ہر نفس کے ساتھ یہ دریا دلی اچھی نہیں

•

تمہیدِ التفات ہے یہ سرخیٔ حیا　　جیسے شفق دلیل سحر کے ظہور کی

•

یہ انجم بوس ایوانوں کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں　　خدا انسان کو سمجھا رہا ہے استعاروں میں

•

کیا سرد پڑ گئی ہے محبت کلیم کی　　یا آپ کی نگاہ میں جلوے نہیں رہے

•

خود وقت کے قدموں میں زنجیر نظر آئی　　جب آپ کی آمد میں تاخیر نظر آئی

•

تیری دزدیدہ نگاہی کی ہے قیمت کتنی　　میں تو ہاتھوں پہ اٹھائے ہوئے سر لایا ہوں

•

کیا جانے کس خیال میں گم تھا اسیرِ نو　　اپنے پروں کو خواب میں پھیلا کے رہ گیا

تابانیوں سے چشمِ تماشا ہے منفعل
مجھ کو قریب لا کے بہت دور کر دیا

سنہ ۱۹۳۸ء

سرِ حشر یہ کون مسند نشیں ہے
کوئی دیکھا بھالا ترا یا جبیں ہے

•

ٹپک پڑا تھا جو میری آنکھوں سے آرزوؤں کی کشمکش میں
اٹھا لیا ہے پروں پہ جبریل نے وہ قطرہ مرے لہو کا

•

ترے وجود سے وابستہ ہے مرا احساس
اب ایک تُو جو نہیں، انجمن نہیں باقی

•

مجھ کو ہی طلب کا ڈھب نہ آیا
ورنہ ترے پاس کیا نہیں تھا

•

حشر میں رہ رہ کے کیوں گرتا ہے آنچل آپ کا
جانے کس آشفتہ سر کی خاک دامن گیر ہے
گو کسی کا عکس کھینچا ہے یہاں ارژنگ نے
پر اسی پردے میں خود ارژنگ کی تصویر ہے

•

اب تک نہ ملی منزلِ مقصود کسی کو
ہر ذرۂ ناچیز مگر گرمِ سفر ہے

•

سجدے بھی ہیں ثنا بھی ہے حمد بھی ہے دعا بھی ہے
اشک مگر کہیں نہیں دامنِ پاکباز میں

اک بڑا حادثہ تھا، ایک بڑا سانحہ تھا
اوّل اوّل تری نظروں سے ٹنا سا ہونا

•

میں دعا مانگتا ہوں رسمِ جہاں کی خاطر
ورنہ مدّت سے نہیں خواہشِ تاثیر مجھے

•

حرم فضا میں ابھر کر مرے قریب آیا
کھڑا ہوں جوشِ عبادت میں سر جھکائے ہوئے

•

میں ان کھڑکتی ہوئی خشک پتیوں کے قریب
گرجتا گونجتا ابرِ بہار دیکھتا ہوں

•

میں ان کو اپنی نگاہوں میں جذب کر لونگا
مجھے وہ اپنی تجلّی کے روبرو تو کریں

•

تیری حالت پہ حیف ہے اے دل
تیری نگری میں تیرا راج نہیں

•

گو روحِ زندگی کے فسوں سے اداس تھی
مرنے کے وقت بھی مجھے جینے کی آس تھی

•

عام یوں بھی کوئی کرتا ہے تجلّی حسن کی
کر دیا ہے آپ نے کونین کا سائل مجھے

•

یہ عدم میں کس کی کرنوں سے الجھنا پڑ گیا
اک ترا جلوہ ہی تا حدِّ نظر سمجھا تھا میں

وہ آئے اور کلبۂ غم میں دیا نہ تھا | میں نے جہاں کو پھونک دیا اضطراب میں
یہ بھی کوئی ادا ہے تری چشم ناز کی | راتوں کو جاگتا ہوں میں امّیدِ خواب میں

•

ترے ہجر کے تصدق کہ نہیں ہے جس کے دم سے | مجھے اپنی زندگی سے گلۂ گریز پائی

۱۹۳۹ء

ہر اک کے دل میں تمنّا ہے باریابی کی | کسی کے مدِّ نظر بحرِ بیکرانہ نہیں

•

میری آنکھوں میں کھٹکتے ہیں نشیب اور فراز | میری نظروں میں دو عالم کو برابر کر دے

•

ہر سمت ترا عکس حسیں رقص کناں ہے | اٹھ کر بھی ترے خواب سے بیدار نہیں ہوں

•

ہم نظر تک اٹھا نہیں سکتے | آپ مصروف منہ چھپانے میں

•

وہ مجھے بھولنے کی دھن میں ہیں | یہ مری فتح ہے شکست نہیں

•

گو اپنے گناہوں سے انکار نہیں مجھ کو | رسوائیٔ آدم ہے لیکن تری رسوائی

میرے پر حوروں نے تھامے میرا سر جبریل نے — تجھ کو کیسے میری کوتاہی کا عرفاں ہو گیا

•

ابھی میں ابتدا کے پیچ و خم ہی سے نہیں نکلا — کوئی کہتا ہے دل میں ماورائے انتہا ہو تم

•

ہے ان کی پردہ نشینی کا راز پردہ دری — وہ راز کھل نہ سکے جو چھپائے جا نہ سکے

•

تو نے اک روز نہ ملنے کی قسم کھائی تھی — میں کہیں کا نہ رہا، تیرا کہا ہو جائے

•

منتشر ہو کہ بھی وہ جلوے کہیں مستور ہیں — راز کے یوں عام ہونے میں بھی کوئی راز ہے

•

تو خاک مجھ سے چھپے گا اے دوست تجھ کو شاید خبر نہیں ہے — کہ میں نے چٹکی میں تھام رکھا ہے مدتوں سے نقاب تیرا

•

نظارۂ رخ سے مجھے فرصت ہی نہیں ہے — کہنے کو تو کہتا ہوں کہ تو پردہ نشیں ہے
اس درجہ ہوئیں حسن سے مانوس نگاہیں — ذرہ بھی حسیں اور ستارہ بھی حسیں ہے

•

کیوں اتنی بلندی پہ کاشانہ بناتے ہو — کیوں خاک نشینوں کو دیوانہ بناتے ہو
سو روپ میں آتے ہو سو رنگ دکھاتے ہو — تم خود مرے سینے میں بت خانہ بناتے ہو

۱۹۴۰ء

سر بسر پیکرِ ملال ہوں میں
روح کے بوجھ سے نڈھال ہوں میں

•

مرنا ترے بغیر مجھے تو نہیں قبول
گو یہ بھی جانتا ہوں کہ مرنا ضرور ہے

•

کتنا پھیکا ہے ترے رحم و کرم کا قانون
ہاتھ ملتا کوئی اٹھا، کوئی سرشار گیا

•

زندگی ایک تبسم کے عوض بیچوں گا
زندگی تیرے تبسم کا مگر مول نہیں

•

مرنا تری طلب میں مرا رائگاں نہ ہو
ڈرتا ہوں اُس زمیں پہ یہی آسماں نہ ہو

•

اُس کی رحمت سے کسے انکار ہے، لیکن ندیمؔ
شمع کی تقدیر میں جلنا تھا، جلتی رہ گئی

•

میں نے سمجھا، مری تقدیر نے پلٹا کھایا
جب بگولا کوئی اُٹھا مرے ویرانے میں

•

یہ زندگی تو بس اک شمعِ محفلِ غم ہے
اِدھر جلائی گئی اور اُدھر بجھائی گئی

•

مجھے تو بس خود اپنے عشق کا ظرف آزمانا ہے
نہ شوقِ سرخوشی نے خواہشِ انعام ہے ساقی

•

اندھیری رات میں بلند و پستِ کائنات پر
سکوت بن کے پھیلتی چلی گئی نوائے دل

۱۹۴۱ء

کیا جانوں آج کس کا مجھے انتظار ہے
پلکوں کی اک جھپک بھی مجھے ناگوار ہے

•

جانتا ہوں کہ خطاکار ہوں، لیکن یارب
یہ بھی کہہ دے کہ ترا لطف خطاپوش نہیں

جدھر دیکھوں ادائے ناز سے وہ مسکراتے ہیں
مجھے تو آجکل بیداریوں میں خواب آتے ہیں

•

جب تو نے پردے ڈال دیئے روئے ناز پر
یوں سوئے ہم کہ بھول کے بھی آنکھ وا نہ کی

•

دل کا ماتم کروں تو کس پہ کروں
جو دیا تھا وہی لیا تو نے

•

پازیب کا چھناکا، آنچل کی سرسراہٹ
یہ کون آرہا ہے، اے زیست کان دھرنا!

•

جکڑی ہوئی ہے ان میں میری ساری کائنات
گو دیکھنے میں نرم ہیں تیری کلائیاں

•

شاید اک تازہ جہاں کی ہیں نقیب
ابنِ آدم کی فلک پیمائیاں

•

مجھے کیا امتیازِ خیر و شر ہے، جب مشیّت کا
غریب انسان کی ہر سانس پہ ہے اختیار اب تک

۱۹۴۲ء

ذکر اک روز پلٹنے کا کیا تھا تم نے
اک دیا دل کے اندھیرے میں جلا رکھا ہے

•

فاش کرتی ہیں مری تنہائیاں سرِ وجود
بارہا شبنم کے اک قطرے میں دنیا آگئی
راہ تکتے تکتے جب کھڑکا کوئی پتہ ندیم
آسمان گونجا، فضا کانپی زمیں چکرا گئی

•

عجیب سحرِ خودی ہے، عجیب مستی ہے
کہ تیر نغمہ بھی اب سامعہ نواز نہیں

•

رستے پار اترنے کے ابھی بند نہیں
ناخدا تو مری قسمت کا خداوند نہیں

یہ ننھی کلی اور ژولیدہ زلفیں — کدھر گھومتی آ گئی یہ حسینہ

•

کماں کی لچک وقت نے چھین لی — کہ اب چوکتے ہیں نشانے ترے

•

اب تو وصالِ یار سے بہتر ہے یادِ یار — میں بھی کبھی فریبِ نظر کا شکار تھا
تو میری زندگی سے بھی کترا کے چل دیا — تجھ کو تو میری موت پہ بھی اختیار تھا
پلکیں اٹھیں، جھپک کے جھکیں، پھر نہ اٹھ سکیں — یہ اعتبار ہے تو کہاں اعتبار تھا

سنہ ۱۹۴۳ء

میرے آنسو ترے دامن کو ترستے ہی رہے — تارے گردوں سے اتارے تری انگڑائی نے

•

آبگینے چھلک چھلک کے اٹھے — کون بیٹھے گا اب قرینے سے

سنہ ۱۹۴۴ء

لطف تو جب تھا طوفانوں میں اسکی لو تھراتی رہتی — جس نے تیری راہ نہ دیکھی اب وہ دیا جلاتا کیسا

•

دیئے جو راہِ وفا پر جلائے تھے میں نے — وہ بارگاہِ جفا سے چرائے تھے میں نے

سنہ ۱۹۴۵ء

تصور آپ کا، احساس اپنا، ہمرہی دل کی — محبت کی اسی تقسیم نے منزل سے بہکایا

•

بکھیر آتا میں اپنے آنسوؤں کو آسمانوں پر — اگر مجھ کو تری انجم خرابی کی خبر ہوتی

•

میں تجھ کو بھول چکا لیکن ایک عمر کے بعد — ترا خیال کیا تھا کہ چوٹ ابھر آئی،
بگولے رقص میں ہیں، دشت کپکپاتا ہے — کس انقلاب کی اے رہرو خبر آئی!